رجسٹرڈ نمبر اے ۶۶۴۸

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور رہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۳۴۲ صفحات۔ کاغذ سفید۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت ... علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

نہایت ضروری اطلاع :-

چونکہ رجسٹری کی فیس اب چھ آنے ہوگئی ہے، اس لئے "نگار" کا سالانہ وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے کے بجائے آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں روانہ ہوگا ——— آپ اس نقصان سے اس طرح بچ سکتے ہیں کہ سالانہ چندہ آٹھ روپے ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ منیجر

نگار

اڈیٹر : نیاز فتحپوری

جلد ٦٣	فہرست مضامین مارچ ۵۳ء	شمارہ ٣

ملاحظات ---------- ٢

یادرفتگاں (رام پور کا ادبی مرکز) ... کلب علی خاں فائق رامپوری ٦

وادیٔ کشمیر کی تاریخ پر سرسری تبصرہ ------ ١٧

چند لمحے داغ کے ساتھ --- خلیل الرحمان اعظمی ام - اے - ٢٢

مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء --- مفتون احمد ----- ٢٧

سائنس کے نظر نہ آنے والے آلات ------- ٣١

داغ کی شاعری کے صحت مند عناصر - اسلوب احمد انصاری - ٣٤

گاہے گاہے بازخواں (ہمارے علماء کا نقطۂ نظر) ---- ٤١

ابوالہول کی بیداری -------- ٤٤

منظومات --- ساقی جاوید، فضا ابن فیضی، تنویر احمد، ذوق، جگر بریلوی، اکرم دھولیوی، افتخار اعظمی -- ٤٧

مطبوعات موصولہ --------- ۵٣ / ۵٦

معذرت والتماس

اس وقت تک ریویو کے لئے جتنی کتابیں موصول ہوئی ہیں گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہم صرف چند پر اظہار خیال کرسکے ہیں، امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں ہم باقی کتابوں پر بھی اپنا تبصرہ پیش کرسکیں گے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنا ہے وہ یہ کہ اکثر پبلشرز اور مصنفین، ریویو کے لئے اپنی مطبوعات کی صرف ایک کاپی روانہ کرتے ہیں، حالانکہ انھیں دو کاپیاں بھیجنا چاہئے۔ امید ہے آیندہ اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

دوسری معذرت

افسوس ہے کہ اس اشاعت میں ہم فرہنگ پارسی کے اوراق کے لئے جگہ نہیں نکال سکے۔ آیندہ اس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔

من ویزداں

کے متعلق اکثر حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ دو جلدوں میں شایع ہوئی ہے، حالانکہ وہ ایک ہی جلد میں تمام ہوگئی ہے۔

مذہبی استفسارات وجواب کا مجموعہ بالکل دوسری چیز ہے اور من ویزداں کے کسی مضمون کا تعلق اس سے نہیں ہے، اسی طرح مذہب بھی ایک علحدہ کتاب ہے لیکن مناسب یہی ہے کہ مذہب کے موضوع پر ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ من ویزداں کا دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے اور اپریل تک غالباً شایع ہوجائے گا۔

پاکستان کے لئے ہمارے ایجنٹوں کے پتے نوٹ کرلیجئے :-

١ - ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ٢٢٢، الٰہی بخش کالونی کراچی

٢ - ملک دین محمد اینڈ سنز بل روڈ لاہور

آپ ان کو سالانہ چندہ بھیجکر نگار کے خریدار ہوسکتے ہیں اور کتابوں کی قیمت بھیجکر وہ بھی ہم سے حاصل کرسکتے ہیں۔ منیجر

( ) (داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا' اپریل کا پرچہ ذریعہ وی - پی 8/ روپیہ میں روانہ ہوگا - آپ کا فائدہ اسی میں ہے کہ چندہ 8/- روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں)

ملاحظات

چند تاثرات :

پچھلے سال مجھے دو بار کراچی جانے کا اتفاق ہوا - پہلی بار مارچ ۵۲ء میں ایک ادبی صحبت کی شرکت کے لئے - دو بارہ نومبر ۵۲ء میں محض احباب و اعزہ سے ملنے کی غرض سے اور ان دونوں زمانوں کے دو بالکل مختلف اثرات لیکر واپس آیا

اول مرتبہ ہر چند میرا وقت زیادہ تر احباب کی دید و باز دید ہی میں صرف ہوا اور پاکستان کے مطالعہ کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ لوگ فی الجملہ مطمئن ہیں اور بقاء حیات کے لئے جو جدو جہد وہاں جاری ہے وہ لاکھ صبر آزما سہی لیکن مایوس کن نہیں ہے' غلّہ ارزاں تھا، تجارتی کساد بازاری شروع نہ ہوئی تھی' لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، زندگی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے - نوابزادہ لیاقت علی خاں کی وزارت عظمیٰ کے اثرات ہنوز کچھ کچھ باقی تھے اور دستور کی تشکیل و نفاذ میں زیادہ اُلجھنیں پیدا نہ ہوئی تھیں، لیکن آٹھ مہینے بعد ہی جب میں دوسری بار نومبر میں وہاں پہونچا تو دنیا بالکل بدلی ہوئی تھی - غلّہ کم یاب تھا، تجارتی کساد بازاری کے ساتھ گرانی بڑھتی جارہی تھی، حکومت کے خلاف مایوسانہ برہمی عام ہوتی جاتی تھی، ملّازم نے حکومت کے خلاف محاذ قایم کرکے دستور کے مسئلہ میں کافی اُلجھنیں پیدا کر رکھی تھیں، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تعلقات میں باہم کشیدگی بڑھتی جارہی تھی اور خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت عظمیٰ غیر مقبول و نامطبوع تھی -

چند مہینوں میں اتنا تغیر، اس قدر ذہنی انقلاب، ایسا نمایاں اضطرار و اضطراب! یقیناً افسوس کی بات تھی، لیکن حیرت کی نہیں، کیونکہ پاکستان کی وہ خصوصیت جس نے اس وقت تک وہاں کی آبادی میں ایک کیفیت دلجمعی کی پیدا کر رکھی تھی، غلّہ کی ارزانی تھی اور اسی کے ساتھ یہ یقین کہ چاہے جو کچھ ہو لیکن پاکستان میں رزق کی کمی نہیں ہوسکتی، اس لئے جب دفعتاً اس کی یہ خصوصیت باقی نہ رہی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ پاکستان میں بھی جو غلّہ کا گھر ہے انسان کسی نہ کسی وقت غذائی مشکلات میں مبتلا ہوسکتا ہے تو ان میں ایک نفسیاتی ردعمل شروع ہوا اور چونکہ ان کے نزدیک اس کا تنہا سبب حکومت کی بدنظمی تھی اس لئے انھیں قدرتاً موجودہ وزارت کے خلاف برہم ہونا چاہئے تھا -

اگر غلّہ کی گرانی و کمیابی کے ساتھ آمدنی کا اوسط بڑھ جاتا یا زندگی کی دوسری ضروریات آسانی سے فراہم ہوسکتیں، تو شاید یہ ردعمل اتنا شدید نہ ہوتا، لیکن بدقسمتی سے چونکہ اس دوران میں ملک کی عام اقتصادی حالت بھی خراب ہوتی جارہی تھی، لوگوں کے ذرایع آمدنی تنگ ہوتے جارہے تھے، تجارتی کساد بازاری بھی بڑھ چلی تھی، اس لئے غلّہ کی گرانی کو اور زیادہ محسوس کیا جانے لگا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر وہ آواز جو حکومت کے خلاف بلند ہوئی، عوام اس کا ساتھ دینے لگے، وہاں کے حزب مخالف اور دوسری جماعتوں نے جو حصول اقتدار کے لئے جدو جہد کر رہی ہیں اس موقع سے فایدہ اُٹھاکر لوگوں کی ذہنیت کو حکومت کے خلاف زیادہ مسموم کرنا شروع کیا اور مولویوں نے بھی اپنے "مطالبات کتاب و سنت" میں شدت پیدا کرکے تشکیل دستور کی راہ میں ایک سنگ گراں حایل کر دیا -

ان تمام باتوں کو علحدہ علحدہ دیکھئے تو شاید ان کی اہمیت محسوس نہ ہو، لیکن جب یہ سب کی سب ایک ساتھ جمع ہو جائیں گی

تو ظاہر ہے کہ راعی و رعایا کے تعلقات پر یقیناً ان کا اثر ناخوشگوار ہوگا ——— حکومت کو ملک کے مزاج میں توازن قایم رکھنے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا اور عمومی طور پر اس کا جو اثر ملک پر ہوگا وہ نظام حکومت کے لئے بہت سی داخلی و خارجی پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

ظاہر ہے کہ کسی ملک کی حالت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی، قحط بھی پڑتے ہیں، اقتصادی توازن بھی خراب ہوتا ہے، کساد بازاری سے بھی واسطہ پڑتا ہے، گرانی بھی ہوتی ہو اور اس قسم کی دوسری دشواریاں بھی پیش آتی ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان طبعی یا غیر طبعی حالات کی بنا پر حکومت ہمت ہار بیٹھے اور ملک کو تباہ ہو جانے دے۔ اس لئے میں یہ تو نہیں کہتا کہ پاکستان کی موجودہ مشکلات دور نہیں ہو سکتیں اور ان دشواریوں کا کوئی حل نہیں ہے، لیکن یہ یقیناً کہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے اربابِ حکومت جن زاویوں سے ان تمام مسایل پر غور کر رہے ہیں وہ بنیادی طور پر غلط ہیں۔

مثلاً گرانی غلّہ کو لیجئے کہ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان نے نہروں کا پانی کافی مقدار میں پہونچنے نہیں دیا، اس لئے پیداوار بہت کم ہوئی، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سندھ اور پنجاب میں غلّہ کی کمیابی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہاں کا موجودہ کاشتکار اتنا محنتی و جفاکش نہیں ہے جتنا پہلے کا تھا، دوسرے یہ کہ وہاں کی بہت سی قابلِ زراعت زمین ہر سال غیر مزروعہ چھوڑ دی جاتی ہے اور تیسرا یہ کہ جو کچھ غلہ وہاں پیدا ہوتا ہے اس کا کم از کم ۳۰ فی صدی حصہ ناجایز طریقہ سے باہر چلا جاتا ہے اور یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جو خود پاکستان ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اسی کو ان کا سدِّباب کرنا چاہئے۔

پاکستان کو درآمد برآمد میں بھی کروڑوں روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے کیونکہ جوٹ اور روئی کی لاکھوں گانٹھیں بیکار پڑی ہوئی ہیں اور ان کی مانگ بہت کم ہو گئی ہے، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ پاکستان کے روپیہ کی قیمت زیادہ ہے اور دوسرے ملکوں کو یہ چیزیں یہاں سے حاصل کرنے میں گراں پڑتی ہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ پچھلے دو سال کے اندر پاکستان نے روئی اور جوٹ کی کاشت کو بہت بڑھا دیا، حالانکہ اسے سمجھنا چاہئے تھا کہ دوسرے ملکوں میں جو اسٹاک ان چیزوں کا محفوظ ہے وہ جنگ کا اندیشہ کم ہو جانے کی وجہ سے بازار میں آجائے گا اور پاکستان سے روئی اور جوٹ کی درآمد قدرتاً کم ہو جائے گی۔ ان حالات میں اسے روئی اور جوٹ کی کاشت کم کر کے صرف غلّہ کی پیداوار کو بڑھانا چاہئے تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف غلّہ کم پیدا ہونے کی وجہ سے گرانی بڑھ گئی اور دوسری طرف اس کی درآمد برآمد کا توازن خراب ہو گیا۔ یہ بات بھی پاکستان ہی کے سمجھنے کی تھی، لیکن اس نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔

تشکیل دستور کے سلسلہ میں جو مشکلات اس وقت وہاں کے ملّاؤں نے پیدا کر رکھی ہیں، ان کی ذمہ دار بھی خود پاکستان کی حکومت ہے۔ اس باب میں اس کی سب سے پہلی غلطی تو یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اس نے فوراً کوئی دستور مرتب نہیں کیا، حالانکہ اگر قایدِ اعظم کے زمانہ میں دستور بن جاتا تو کوئی چوں و چرا کرنے والا نہ تھا اور اس وقت تک وہ ملک میں اپنی جگہ بنا لیتا، اس کے بعد دوسری غلطی جسے میں بہت بڑی اُصولی غلطی کہتا ہوں نوابزادہ لیاقت علی خاں نے کی۔ انھوں نے جب کبھی کسی تقریر کے دوران میں دستور کا ذکر کیا تو نہایت صاف الفاظ میں مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہوگی اور اس بات کو اتنی مرتبہ انھوں نے دہرایا کہ عوام کے دل میں یہ بات جم کر رہ گئی کہ پاکستان کا آیندہ دستور یکسر شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا۔ پھر نوابزادہ مرحوم نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ جس وقت دستور عوام کے سامنے آئے گا تو انھیں کیونکر یقین آئے گا کہ دستور واقعی کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس باب میں حکومت سے تو پوچھیں گے نہیں، مولویوں ہی سے استصواب کریں گے اور مولوی یقیناً اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر اپنے اقتدار کا سودا حکومت سے شروع کر دے گا۔

چنانچہ جس وقت یہ اعلان ہوا کہ ۲۲ نومبر کو دستور کمیٹی کی تجاویز ایوان کے سامنے پیش کر دی جائیں گی تو مولویوں نے "مطالبۂ کتاب و سنت" کے مظاہرے زیادہ شدت سے شروع کر دئے، یہاں تک کہ آخر کار خواجہ ناظم الدین صاحب کو اس کا التوا کرنا پڑا اور

جب ولایت سے لوٹ کر ۲۲ دسمبر کو انھوں نے ان تجاویز کو پیش کیا بھی تو وہ "ملاازم" کی رعایت سے خالی نہ تھیں، اور فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دستور کی نوعیت واقعی کیا ہوگی اور ملاازم کو خوش کرنے کے لئے پاکستان کس حد تک اپنی بین الاقوامی اہمیت کی قربانی گوارا کرسکے گا، اس دوران میں ایک اور نہایت اہم خبر پاکستان کے متعلق یہ سننے میں آئی کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی اسکیم میں شرکت کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے۔ ہر چند اس کی تصدیق نہ پاکستان کی طرف سے ہوئی ہے نہ برطانیہ و امریکہ کی طرف سے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ امریکن بلاک اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے بیتاب ہے اور اس کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ پاکستان بھی اس پیکٹ میں شریک ہوجائے کیونکہ پاکستان کے شمول سے وہ روس کے خلاف اپنا خط مدافعت و اقدام سرزمین روس سے قریب تر قائم کرسکے گا۔

امریکہ کی یہ اسکیم، اٹلانٹک پیکٹ اور مارشل پلان ہی کی ایک کڑی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ مشرق وسطیٰ کو تمام حکومتوں کے ساتھ مصر اور پاکستان کو بھی اس میں شامل کرسکا تو یہ نہ صرف روس کے خلاف اس کی بڑی کامیابی ہوگی بلکہ اس کے اثرات بحرالکاہل اور اور تمام ایشیا تک پھیل جائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ حکومتیں جو اس اسکیم میں شریک ہوں گی، ان کا کیا حشر ہوگا، امریکن بلاک کی یہ اسکیم در اصل ایک سودا ہے جو وہ مصر و پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں سے کرنا چاہتا ہے اور جس حد تک روپیہ کا سوال ہے وہ منھ مانگی قیمت دینے پر آمادہ ہوجائے گا، لیکن اس رشوت کے عوض مشرقی حکومتوں کو کیا دینا پڑے گا، اس کا تصور بھی حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی اقتصادی حالت فی الحال اچھی نہیں ہے، وہاں کا معاشی نظام بھی بہت غیر متوازن ہے، کشمیر کے معاملہ میں وہ امریکن بلاک کی زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کرنے کا بھی متمنی ہے، اپنے صنعتی اداروں کو فروغ دینے کے لئے وہ امریکی ڈالر اور امریکی ماہرینِ فن سے بھی فایدہ اٹھانا چاہتا ہے، لیکن ان تمام قوی محرکات کے باوجود اس کا مشرق وسطیٰ کی دفاعی اسکیم میں شریک ہونا اپنی قومی خودداری اور سیاسی آزادی کو ہاتھ سے دیدینا ہے اور ایسی معمولی قربانی نہیں، جسے پاکستان کی غیرت گوارا کرسکے۔ ظاہر ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے پیکٹ میں شامل ہونے کے بعد پاکستان امریکہ کی ایک کالونی بن کر رہ جائے گا، اور تمام سیاسی و اقتصادی اقتدار امریکہ کو سونپ دینا پڑے گا۔ بالکل اسی قسم کی گفت و شنید امریکن بلاک مصر سے بھی کر رہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ سوئز کا مسئلہ جنرل نجیب کی مرضی کے مطابق طے ہوجانے پر وہ اپنی رضامندی ظاہر کردے، لیکن پاکستان کا مصر کی مثال اپنے سامنے رکھکر کوئی فیصلہ کرنا خلاف دانشمندی ہوگا، کیونکہ پاکستان کی جغرافی و سیاسی پوزیشن مصر سے بالکل مختلف ہے اور اس کا اپنے سیاسی موقف کو غیر ایشیائی نقطۂ نظر سے دیکھنا اس کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہوسکتا۔

پاکستان کو یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ گو وہ جغرافی حدود کے لحاظ سے ہندوستان سے علحدہ ہوگیا ہے، لیکن اور تمام حیثیتوں سے پاکستان و ہندوستان اب بھی دونوں ایک ہیں، اور دو مختلف سمتوں کی طرف رُخ کرکے ان کا قدم اُٹھانا دونوں کے لئے یکساں نقصان رساں ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کا اس پیکٹ میں شامل ہونا امکاناتِ جنگ کا حدود ہندوستان سے قریب تر ہوجانا ہے اور ہندوستان اسے کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ پھر ہوسکتا ہے کہ پاکستان محض انتقامی جذبہ کی بنا پر یا کشمیر کے مسئلہ کو اپنے موافق طے کرانے کے خیال سے اس پیکٹ میں شامل ہونے کا فیصلہ کرے، لیکن اس کا یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ اب یا آیندہ کسی وقت اگر امریکن بلاک پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی ایک کی دوستی اختیار کرنے پر مجبور ہوا، تو وہ ہندوستان کی دشمنی مول لینے کی حد تک پاکستان کا ساتھ کبھی نہ دے گا اور اس کے کھلے ہوئے اسباب ہیں۔ اس وقت دنیا کی سیاست جس محور پر گردش کر رہی ہے وہ اشتراکیت وجمہوریت یا بالفاظ دیگر روس و امریکہ کا اختلاف ہے، اس وقت دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کی بیرونی سطح کھرچنے کے بعد آپ کو اس کے نیچے اسٹالین یا صدر جمہوریہ امریکہ کی تصویر نظر نہ آئے۔ اور اشتراکیت وجمہوریت کی اس ٹھنڈی لڑائی میں (جس میں کسی وقت بھی گرمی پیدا ہوسکتی ہے) امریکہ کو اس کی زیادہ فکر نہیں ہے کہ روس کے اثرات مغربی یوروپ میں وسیع ہوتے جا رہے ہیں، بلکہ اس کو زیادہ تشویش اس بات کی ہے کہ سواحل بحرالکاہل تک اس کا سایہ پھیلتا جا رہا ہے اور ایشیاء میں اسکے اثرات

چین سے گزرکر برما اور حدودِ ہندوستان تک وسیع ہوتے جارہے ہیں، چنانچہ اسی لئے صدر امریکہ کے نئے صدر نے فارموسا میں چیانگ کائی شیک کو کوریا کی جنگ میں شریک ہوکر چین کے خلاف اقدام کرنے کی اجازت دیدی ہے اور اس کو ہر قسم کی مدد دینے کا تہیہ کرلیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ امریکہ اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ وہ اشتراکیت کے اس سیلاب کو ایشیاء میں پھیلنے سے نہیں روک سکتا، جب تک ہندوستان اس کا ساتھ نہ دے اور اس لئے وہ ہندوستان سے کسی صورت میں بگاڑنا پسند نہ کرے گا، خواہ پاکستان کے ساتھ اس کی ہمدردیاں کتنی ہی بڑھتی ہوئی کیوں نہ ہوں۔

ہندوستان اس وقت تک بالکل غیر جانبدار رہنے کی پالیسی پر مضبوطی سے قایم ہے اور روس و امریکہ میں سے کسی کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں، اس لئے اگر پاکستان مشرق وسطیٰ کے پیکٹ میں شامل ہوگیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ لڑائی کی صورت میں آتشِ جنگ ہندوستان کی حدود تک پہونچ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کو مجبوراً اپنی پالیسی بدلنا پڑے اور چین کے ساتھ اپنی قسمت بھی وابستہ کردے۔ امریکہ بھی اس سے اچھی طرح واقف ہے اور اسی لئے وہ کبھی ہندوستان کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھائے گا۔ اس لئے ان حالات میں پاکستان کا مشرقِ وسطیٰ کے پیکٹ میں شامل ہوکر امریکہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کشمیر یا کسی اور مسئلہ میں ہندوستان کے خلاف کوئی قدم اُٹھائے گا صحیح نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم بارہا عرض کرچکے ہیں، پاکستان و ہندوستان دونوں کی بقا اسی میں ہے کہ وہ خود اپنی مدد کرنا سیکھیں، دوسروں کے بھروسہ پر جینا ترک کردیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ دونوں کی خارجہ پالیسی بالکل متحد ہو، دونوں مل کر ایک نیوٹرل بلاک بالکل علحدہ قایم کریں اور کسی ایسے پیکٹ میں شریک نہ ہوں جو انھیں کسی فریق کے ساتھ جنگ کرنے پر اپنے ملک کے اندر کسی غیر ملک کو فوجی اڈے بنانے یا صنعتی کارخانے قایم کرنے کی اجازت دینے پر مجبور کرنے والا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ایک وسیع خلیج بن کر رہ گیا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے کھُل کر ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ جلد یا بدیر اسے کسی نہ کسی طرح طے ہونا ہے اور یہ حالت منتظرہ ابدالآباد تک قایم نہیں رہ سکتی، اسی کے ساتھ دونوں اب یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جن کے ہاتھ میں یہ فیصلہ دیدیا گیا ہے وہ خود اس کا فیصلہ کرنا نہیں چاہتے، اور اس وقت تک برابر انتظار کرتے رہیں گے جب تک خود اپنے اغراض و مقاصد کے تحت انھیں جابرانہ مداخلت کے جواز کا بہانہ ہاتھ نہ آجائے۔

اس لئے دانشمندی کا تقاضا صرف یہ ہے کہ دونوں ملک آپس میں مل کر اس جھگڑے کو طے کریں اور ان کے اکابر خلوص نیت اور پورے جذبۂ رواداری کے ساتھ باہمدگر تبادلۂ خیال کریں اور اگر مفاہمت کی کوئی صورت ایسی پیدا ہوسکتی ہے جس پر دونوں کا اتفاق ممکن ہو تو فریقین کو چاہئے کہ اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں خواہ اس کے لئے انھیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔

اس دوران میں کبھی کبھی یہ آواز بھی کانوں میں آئی کہ خواجہ ناظم الدین صاحب اور پنڈت نہرو کے درمیان دو بدو گفت وشنید کی راہیں کھلنے والی ہیں، اگر یہ صحیح ہے (اور صحیح نہیں ہے تو اسے ہونا چاہئے) تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کیونکہ باہمی مفاہمت اور آپس کے ناخوشگوار تعلقات دور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دونوں آپس میں ملیں اور برابر اسوقت تک ملتے رہیں جب تک آپس کی بدگمانیاں دور نہ ہوجائیں، اور پاکستان کا یہ خیال اس کے دل سے نہ نکل جائے کہ کشمیر یا کسی اور نزاعی مسئلہ کا فیصلہ تیغ و تفنگ سے بھی ہوسکتا ہے۔

ہندوستان نہایت صفائی سے بارہا اعلان کرچکا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف جنگ کرنے میں کبھی اقدام نہ کرے گا اور پاکستان کے ساتھ وہ اس کا معاہدہ کرنے کے لئے بھی آمادہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ پاکستان کی طرف سے ابتک اس تحریک کا خیر مقدم نہیں کیا گیا، حالانکہ اگر وہ آیندہ کسی وقت جنگ پر مجبور ہو تو بھی یہ معاہدہ اس کے حق میں فایدہ سے خالی نہیں۔

یادِ رفتگاں

رام پور کا ادبی مرکز

ہندوستان میں شاعری کے دو بڑے اسکول غدر سے پہلے پائے جاتے تھے، دہلی اور لکھنؤ، دہلی اسکول کے نمایندے شاہ نصیر اور اُن کے شاگرد تھے اور لکھنوی اسکول کے نمایندے ناسخ، آتش اور اُن کے تلامذہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ جو مشاہیر سخن تھے وہ ادبی روابط کی بنا پر انھیں اسکولوں کے ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دہلی، لکھنؤ کے بعد علم و ادب کا ایک بہت بڑا مرکز رام پور بھی رہا ہے، جسے دہلی و لکھنؤ اسکولوں کا سنگم کہنا چاہئے

ریاست رام پور اگرچہ ایک زمانہ میں[1] (۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء تا ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء) خود مختار ریاست تھی، لیکن نواب شجاع الدولہ کے حملہ کے بعد (۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں) یہ حیثیت جاتی رہی اور وہ اودھ کی حکومت کا جزو قرار پائی۔ قدرتاً اس صورت میں اودھ کی حکومت کا اثر اس کے ہر شعبۂ حیات پر پڑتا، لیکن پٹھانوں کی جداگانہ قومی خصوصیات اور اختلاف مذہب کے باعث لکھنؤ کے بجائے دہلی کا اثر رام پور میں زیادہ پایا جاتا تھا۔

موجودہ رامپور کی بنیاد ایک گاؤں رام پورہ میں نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں پڑی، جامع مسجد رام پور کی بنیاد ۱۱۸۰ھ میں[2] پڑی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۸۰ھ سے پہلے رامپور میں آبادی شروع ہوگئی تھی اگرچہ پایۂ تخت قصبۂ شاہ آباد (موجودہ تحصیل ضلع رامپور) ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء میں بن چکا تھا، نواب فیض اللہ خاں کی نیک نیتی اور داد و دہش سے رام پور علماء و فضلاء و ادبا کا مجمع تھا اور بخارائے ہند کہلاتا تھا، ۵۰۰ علماء وظیفہ[3] پاتے تھے، مولانا بحر العلوم (عبد العلی صاحب) ملا حسن شاگرد ملا کمال الدین برادر زادہ ملا نظام الدین فرنگی محلی۔ مولوی غلام طیب شاگرد ملا کمال الدین۔ حاجی محمد سعید محدث و مولانا جمال الدین صاحب شاگردان شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی۔ مولانا رستم علی شاگرد بحر العلوم۔ مولوی غلام جیلانی رفعت شاگرد ملا حسن و شاہ عبد العزیز محدث وغیرہ سے درس حاصل کرنے نہ صرف ہندوستان بلکہ ترکستان اور افغانستان وغیرہ سے بھی سیکڑوں علم کے پیاسے آکر پیاس بجھا رہے تھے۔

محمد[4] قایم شاگرد درد اور سودا، رامپور کو ۱۱۸۰ھ میں اپنا مسکن بنا چکے تھے، حکیم کبیر علی[5] انصاری کبیر شاگرد حکیم علوی خاں، حکیم صدر[6] الدین آزردہ دہلوی، مولوی قدرت اللہ شوق صاحب تذکرہ طبقات الشعراء (اردو) و تکملۃ الشعراء (فارسی) حکیم میر ضیاء الدین عبرت شاگرد نواب محبت خاں محبت، عنبر شاہ خاں آشفتہ، حافظ عبد الحبیب شیفتہ، عزیز خاں بے جان، اخوند زادہ ہمت خاں ہمت، میر غلام علی عشرت

---

[1] اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۲۷۴ ——— [2] تاریخ جامع مسجد :- یک مسجد فیض کعبۂ نو (۱۱۸۰ھ)

[3] اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۵۵۰ بحوالہ مساکن فلسفی۔ دیوان منولال دہلوی ——— [4] خلاصۂ طبقات الشعرا صفحہ ۳۰ و تکملۃ الشعرا قلمی صفحہ ۱۸۴ و ریاض الفصحا صفحہ ۱۷۹ و فصل الکلام :- در رام پور بسری بود ۱۲۸۸ھ ——— [5] اقتباس العلاج ـ مخطوط از حکیم بایزید۔

[6] دیباچہ مثنوی ۱۲۳۵ھ پدرمات عبرت و عشرت۔ مبلغ خاص گلشن اودھ ۱۲۹۹ھ ——— [7] دیوان عنبر شاہ خاں آشفتہ شاگرد قایم مخطوط۔

شاگرد لطف تلمیذ سودا وغیرہ ریختہ کو رشک فارسی بنا رہے تھے - حکیم صدرالدین خاں آزردہ دہلوی نے سنہ ۱۲۰۳ھ میں بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی مولوی قدرت اللہ شوق کے مکان پر بعد نماز جمعہ ہفتہ وار مشاعرہ ہوا کرتا، (۱۲۱۱ھ تک یہ سلسلہ جاری تھا) اگرچہ نواب فیض اللہ خاں کو شعر و سخن سے دلچسپی نہ تھی مگر اس کی تلافی دوسرے امرائے رام پور کر رہے تھے، نجو خاں (متوفی ۱۲۰۹ھ) کے ملازمین میں حکیم میر ضیاءالدین عبرت - حکیم اصغر علی مروت خلف کبیر وغیرہ تھے، نواب احمد یار خاں افسر، قایم کی مدد کر رہے تھے، نواب نصراللہ خاں سلطان بھی سخن گو اور سخن فہم تھے وہ بھی شعرا کی سرپرستی میں مصروف تھے -

نواب فیض اللہ خاں کے انتقال پر اُن کے بیٹے نواب محمد علی خاں تخت نشین ہوئے لیکن خواص و عوام نے بہت ہی جلد کھلم کھلا اُنکی مخالفت شروع کردی نواب محمد علی خاں، نواب وزیر علی خاں کی شادی کے موقع پر لکھنؤ گئے اور وہاں کے درباری طریقے پسند آگئے، زمام حکومت ہاتھ میں آنے پر یہی درباری آداب رائج کرنا چاہے، پٹھان نواب سے برادرانہ برتاؤ کے متوقع تھے یہ رویہ دیکھ کر کھنچ گئے - اور آخرکار مارے گئے نواب آصف الدولہ نے پہلے تو یہ چاہا کہ معاملہ لین دین سے طے ہو جائے، نواب غلام محمد خاں خلف نواب فیض اللہ خاں جو بھائی کے بجائے تخت نشین ہوئے تھے مصالحت پر آمادہ تھے لیکن افغانی امرا نے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کیا اور مصالحت کی بات ٹھکرا دی، نواب آصف الدولہ انگریزی فوجوں کی حمایت پر لڑنے چلے آئے، انگریزی فوج آگے تھی، موضع بھوڑا[3] (فتح گنج غربی) علاقہ بریلی میں مقابلہ ہوا، پہلے ہی حملہ میں انگریزی فوج کو شکست ہوگئی، دو ہزار تلنگے اور ڈیڑھ سو انگریز مارے گئے، لیکن جبکہ رامپوری فوج لوٹ مار میں مشغول تھی، ایک انگریزی کمپنی نے جو گھات میں تھی بندوقوں کی باڑھ پر رکھ لیا، کچھ مارے گئے باقی بغیر لڑے بھڑے بھاگ کر رامپور پہونچے، بعد میں نواب آصف الدولہ کی فوج فاتحانہ رام پور میں داخل ہوئی اور نواب احمد علی خاں خلف نواب محمد علی خاں کو نابالغی میں تخت نشین کیا، نواب نصراللہ خاں مدارالمہام رہے خزانہ پر قبضہ کیا گیا اور آدھے سے زیادہ ریاست رام پور کا علاقہ ضبط کرلیا، یہ واقعہ ۵ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ کا ہے - یہ واضح رہے کہ نواب محمد علی سے نواب آصف الدولہ نے پگڑی بدل کر بھائی چارہ کیا تھا، نواب غلام محمد خاں جلا وطن ہوئے، اس واقعہ کو مولوی غلام جیلانی رفعت نے فارسی میں (دُرِ منظوم) اور معظم نے اُردو میں نظم کیا -

نواب نصراللہ خاں سلطان کی نیابت سے عوام و خواص بیزار رہے اور ستمبر ۱۸۰۱ء میں رام پور اودھ کی حکومت سے علیحدہ ہوکر برٹش علاقہ قرار پایا، نواب احمد علی خاں صاحب کے قتل میں اہلِ رام پور ملوث تھے اُنھوں نے خواص و عوام سے علحدگی اختیار کی، کبھی کبھی محل میں ایام گزارتے ورنہ بیشتر وقت شکار میں گزرتا رامپوری ارباب علم و فضل بیشتر مختلف ریاستوں میں جا بسے مولوی حیدر علی رامپوری شاگرد و داماد مولوی غلام جیلانی رفعت اور ان کے بھائی مولوی محمد علی رامپوری خلفائے سید احمد شہید رام پور سے ترک سکونت کر گئے، مفتی شرف الدین رام پوری کی تشہیر کی گئی اور وہ بھی شہر بدر ہوئے - ان حالات میں علم و ادب کی ترقی دشوار تھی، پھر بھی مولوی قدرت اللہ شوق کے شاگردوں[4] نے رامپور کی ادبی روایات کو قائم رکھا، رام پور اپنی آبادی کے لحاظ سے بہت مختصر بستی سہی لیکن اس کی علمی و ادبی شہرت سارے ہندوستان میں تھی، اخوند زادہ احمد خاں غفلت، کریم اللہ خاں کرم، حافظ اللہ داد طالب[5] وغیرہ شاگردانِ شوق کے باعث ادبی مجلس برپا ہوتیں اور دادِ سخن دی جاتی - غفلت، مصحفی[6] سے ملاقات کرنے سنہ ۱۲۳۰ھ اور سنہ ۱۲۲۳ھ کے درمیان لکھنؤ پہونچے اور وہاں کے مشاعروں میں شریک

---

[1] تذکرہ ہندی - مصحفی ——— [2] انتخاب یادگار - صفحہ ۳۹ و اخبار الصنادید جلد اول - صفحات ۲۰۸ و ۲۰۹ بحوالہ اخبار حسن -

[3] اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۲۳۹ تا ۲۰۰ ، ——— [4] اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۴۴ ، ———

[5] ریاض الفصحا - فاضلے است متبحر و عالمے است ؟ مسکنش رام پور است عمرش چہل سالہ ؟

[6] ریاض الفصحا صفحہ ۲۴۲ غفلت - - - - - - - - - ازاں شہر خود محض برائے ملاقات فقیر در لکھنؤ آمدہ بود در قصاید و مثنوی داد معنی بندی می دہد -

ہوئے کرم[1] نے دہلی جاکر شاہ نصیر کے مشاعرہ میں (قبل از ۱۲۳۷ھ) شرکت کی اور وہاں کے شعرا سے نوک جھونک رہی، مولوی عبدالقادر غمگین رامپوری صدر الصدور[2] مراد آباد نے رام پور سے ڈھاکہ تک سفر کیا اور واپسی میں آخر عہد نواب سعادت علی خاں (۱۲۲۹ھ) میں لکھنؤ آکر[3] مصحفی، انشاء، شاہ نصیر وغیرہ سے ملاقات کی دہلی جاکر محمد نظام الدین ممنون سے ۲۸ فروری ۱۸۲۴ء کو طے اور مفتی صدر الدین[4] آزردہ[5] وغیرہ سے ملاقاتیں کیں ان دنوں لکھنؤ میں ناسخ وغیرہ ترقی کر رہے تھے اور دہلی میں مومن[6] نوجوان شعرا میں اچھے تھے، ان کے تعلقات خصوصی مرزا اسداللہ خاں غالب[7] سے بھی تھے، اس طرح علمی و ادبی روابط ہندوستان سے رام پور کے ادیبوں نے قایم رکھے۔ ۱۲۹۶ھ میں نواب احمد علی خاں رند کا انتقال ہوگیا، نواب محمد سعید[8] خلف نواب غلام محمد خاں ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء مطابق ۲۱ جمادی الآخر ۱۲۵۶ھ میں تخت نشین ہوئے، یہ بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے رامپور سے نکل کر بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزارا تھا ان کے دوسرے بھائی عبداللہ خاں، حفیظ اللہ خاں، عبدالرحمان خاں، عبدالعلی خاں دہلی میں مقیم رہے ان کے تخت نشین ہونے پر جملہ افراد خاندان نواب غلام محمد خاں رامپور آگئے ان میں صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب، صاحبزادہ عنایت علی خاں عنایت شاگردان مومن بھی تھے، اب رامپور کی اُجڑی بستی پھر بنا شروع ہوئی، لکھنؤ اور دہلی اور دیگر مقامات سے ارباب علم و ادب جمع ہونے لگے، مرزا حاجی (قمرالدین احمد خاں قمر) رامپور گئے نواب محمد سعید خاں بہت احترام سے پیش آے ------ ان کو اپنے پاس نوکر رکھا مرزا علی حسین ان کے بیٹے کو ---- افسری پلٹن دی مرزا رامپور سے پھر کانپور آئے۔ قیصر التواریخ صفحہ ۴۸"

شعرا میں شیخ مہدی علی ذکی[9] مراد آبادی شاگرد ناسخ (۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء) میں آئے، مرزا معین الدین حیدر غمیں شاگرد میرزا کلب حسین خاں نوازش تلمیذ سوز آخر ۱۸۴۰ء میں برائے تعلیم صاحبزادہ محمد کاظم علی خاں طلب ہوئے میر حسین تسکین[10] شاگرد رشید مومن اور میر عبداللہ غمگین پسر تسکین دہلی سے آکر باریاب ہوئے، شیخ علی بخش بیمار[11] شاگرد غفلت رامپوری آنولہ سے آکر داخلِ ملازمت ہوئے ابھی غفلت اور طالب وغیرہ شاگردانِ شوق زندہ تھے اور نو مشقوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے، مولوی عبدالقادر خاں[12] غمگین صدر الصدور مراد آباد بھی طلب ہوکر حاکم عدالت ہوئے اور مولوی فضل حق[13] خیرآبادی بھی نواب یوسف علی خاں کی تعلیم کے سلسلہ میں بلائے گئے، کہنے کو تو رامپور چھوٹی سی بستی تھی لیکن جو مشاہیر ہند یہاں جمع تھے ان کی نظیر دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی، رامپور میں قایم کا سلسلہ بلا واسطہ شاگردانِ شوق سے جاری تھا اور میر محمدی مایل اور شاہ نصیر کے توسط سے شاگردانِ مومن دوسرا سلسلہ قایم کر رہے تھے — حافظ[14] اکرام الدین احمد ضیغم شاگرد و داماد رؤف احمد راحت تلمیذ جرأت سلسلۂ حسرت کی ایک کڑی تھے اور سید جمال[15] شاہ مظلوم و سید منصور علی علی و منصور شاگردانِ نزہت خلف میر ضیاء الدین عبرت اسی سلسلہ کی دوسری کڑی تھے، اس عہد میں بڑا کارنامہ شیخ علی بخش بیمار اور سید احمد علی رسا اور سید نظام[16] شاہ نظام رامپوری کا ہے جنھوں نے پرانی راہوں کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ نکالا زبان کی تراش خراش اور

---

[1] کلیات کرم مخطوطہ صفحہ ۲۶۳ — یاد دارم کہ در شہر شاہجہاں آباد نووارد بودم بسیار شاعراں از من عناد می داشتند وقتیکہ در مشاعرہ (۱۲۳۳ھ) میاں نصیر نشستہ بودم و ہمہ شعرا جمع بودند

[2] روزنامچہ مولوی عبدالقادر رامپوری ورق (۴۰) — [3] صفحہ ۲۲۳ — [4] و [5] صفحہ ۱۳۸ — روزنامچہ — [6] عود ہندی نولکشور پریس کانپور ۱۸۸۶ء صفحہ ۱۵۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور اُن کے امثال اور نظائر کو بھیجی گئی ———— [7] انتخاب یادگار۔ صفحہ ۲۸ — [8] انتخاب یادگار صفحہ ۱۴۰ — [9] مستغنی التواریخ مخطوطہ۔ از علی نقی غنی خلف غمیں ورق (۳) — [10] انتخاب یادگار صفحہ ۹۰ [11] انتخاب یادگار و طور کلیم و بزم سخن و گلستانِ سخن — [12] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۳۴ — [13] مکاتیب غالب — [14] انتخاب یادگار صفحہ ۲۰۶ و سخن شعراء — [15] انتخاب یادگار صفحہ ۲۴۲ و ۲۳۱ — [16] و [17] انتخاب یادگار صفحہ ۱۴۶ و ۳۸۶۔

سلاست کو عملی جامہ پہناکر وارداتِ عشق و محبت میر نظام الدین ممنون[1] اور جرأت کی لے میں ادا کئے، بیمار کا کلام مدون ہوکر سامنے نہ آسکا اور بیشتر تلف ہوگیا معاصرین اُن کی سحر بیانی کے معترف تھے اور طرزِ نو کا بانی سمجھتے تھے، موجودہ کلام جو ہمارے سامنے ہے اُس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہ غلط راستوں سے بچ کر ایک نیا راستہ تلاش کر رہے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوچکے تھے، احمد علی رسا نے اُستاد کے رنگ کا نہ صرف پورا پورا تتبع کیا بلکہ اُس کی تکمیل بھی کی لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کا کلام بھی ضایع ہوگیا، نظام رامپوری نے ادا بندی اور معاملہ نگاری میں کمال فن دکھایا، وہ جانشین میر نہ بن سکے لیکن جرأت کے صحیح جانشین ضرور ہوگئے، ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ میں نواب محمد سعید خاں کا انتقال ہوگیا اور بیمار بھی رخصت ہوئے۔

اب نواب یوسف علی خاں کا دور آیا جنھیں ابتدائے عمر سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی اور مومن سے بزمانۂ قیام دہلی مشقِ سخن کی تھی[2] وہ ابھی نظم ریاست سے فرصت نہ پاسکے تھے کہ غدر برپا ہوگیا جون ۱۸۵۷ء تک رام پور کی فوجیں اضلاع ملحقہ کا نظم و نسق سنبھالنے میں مشغول رہیں اس ہنگامہ میں ہزاروں مصیبت زدہ اشخاص نے رام پور میں پناہ لی اور جب امن قایم ہوگیا تب اپنے گھروں کو سدھارے، قاضی محمد ممتاز حسین ممتاز کی رباعی شکریہ اس واقعہ کی یادگار ہے ؎

امروز کہ جاں[3] زتن رواں افتاد است — مرگ ارزاں زندگی گراں افتاد است

مارا زحیات روزی ارزانی دار — اے یوسفِ وقت قحطِ جاں افتاد است

نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں (۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء تا ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء) جو شاعر رام پور آئے اُن کی فہرست مختصراً یہ ہے:-

	نام شاعر[4]	نام استاد	تاریخ آمد رامپور	تاریخ ملازمت	کیفیت
لکھنوی شعراء	منشی مظفر علی اسیر	شاگرد مصحفی	۱۸۵۹ء / ۱۲۷۵ھ	۱۵ مئی ۱۸۵۹ء[5]	۷ فروری ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء
	منشی امیر احمد امیر	” اسیر	اپریل ۱۸۵۹ء / رمضان ۱۲۷۵ھ[6]		اکتوبر ۱۹۰۰ء متوفی
	میر ضامن علی جلال[7]	” برق	۱۸۵۶ء / ۱۲۷۲ھ		
	منشی امیر اللہ تسلیم	” نسیم دہلوی	نومبر ۱۸۵۵ء	دوبارہ ۱۸۶۳ء ۱۸۶۶ء	مئی ۱۹۱۱ء
دہلوی شعراء	مرزا رحیم الدین حیا[8][9]	” نصیر	۱۸۵۵ء		متوفی ۱۸۹۷ء
	نواب مرزا خاں داغ	” ذوق	آخر ۱۸۵۷ء	۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء	
	آغا مرزا شاغل	” ذوق	آخر ۱۸۵۷ء		
	سید ظہیر الدین ظہیر[10]	” ذوق	۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء		
	سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا انور۔ شاگرد ذوق		۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء		

نواب کلب علی خاں[11] نواب کے عہد میں جو شاعر رام پور آئے (۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء سے ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء) ان کی فہرست یہ ہے:-

	نام شاعر	نام استاد	تاریخ آمد
لکھنوی شعراء	میر محمد زکی بلگرامی	شاگرد دبیر	۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء
	مرزا محسن علی عرف مرزا جو ہندی	شاگرد مصحفی	۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء

---

[1] گلستانِ سخن ص۴۳۳ — [2] انتخاب یادگار ص۳ پہلے مومن خاں دہلوی سے مشورہ رہا — [3] گلدستۂ سخن آگرہ ۱۸۸۳ء - ۱۸۹۸ء لسٹ ص۹ [4] اخبار الصنادید جلد ۲ - ص۱۰۰ بزمرۂ شعرا - ایک سو روپیہ مشاہرہ — [5] رپورٹ انتظامیہ ریاست رامپور حصہ اول - مطبوعہ — [6] سوانحِ امیر ممتاز علی آہ ص۴ — [7] انتخاب یادگار - ص۱۰۲ و تذکرہ کاملانِ رامپور ص۱۱۱ بارہ سو بہتر ہجری میں نواب یوسف علی خاں نے طلب فرمایا - [8] خمخانۂ جاوید جلد ۲ ص۱۵ [9] داستانِ غدر ظہیر دہلوی و انتخاب یادگار و اخبار الصنادید ج ۲ — [10] داستان غدر ظہیر دہلوی - [11] انتخاب یادگار و کلیات منیر مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۶ھ ص۲۱

میر یار علی جان صاحب - شاگرد نواب عاشور علی خاں ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء

سید محمد اسمٰعیل حسین منیر - شاگرد ناسخ و اشک - رمضان ۱۲۸۷ھ[1] مطابق نومبر ۱۸۷۰ء

منشی[2] احمد حسن خاں عروج - " ایضاً ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء

شیخ[3] امداد علی بحر - شاگرد ناسخ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء

منشی[4] امیر اللہ تسلیم - شاگرد نسیم دہلوی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء

خواجہ[5] ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد شاگرد ناسخ و وزیر - اگست ۱۸۷۵ء

گوبند لال حیا ۱۸۷۵ء / ۱۲۹۲ھ

حسین علی خاں شاداں - شاگرد غالب ۱۲۸۳ھ - ۷ر ستمبر ۱۸۷۸ء مطابق متوفی شوال ۱۲۹۶ھ

دہلی ——— نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں نواب کے عہد میں جو اجتماع شاعروں کا ہوا اُس کو علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا زمانۂ غدر سے نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے انتقال تک یہ ادبی محفل جمتی رہی اور اُن کے انتقال پر ختم ہوگئی، رام پور میں جو مقامی شعرا اس عہد میں تھے اُن کی نہایت مختصر سی فہرست پیش کی جارہی ہے تاکہ مقامی شعرا کی حیثیت واضح طور پر سامنے آجائے۔

حافظ اللہ داد عرف شبراتی طالب - شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق - ولادت ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء - وفات ۲۹ر شوال ۱۲۷۵ھ مطابق یکم جون ۱۸۵۹ء

حکیم احمد خاں فاخر - شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق ولادت ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء - متوفی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء بعمر نوے سال

میر شرف الدین ششدر - شاگرد غفلت - ۲۵ر ذی حجہ ۱۲۷۴ھ مطابق اگست ۱۸۵۸ء

صاحبزادہ فصیح اللہ خاں مقتول - شاگرد غفلت ولادت ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء متوفی ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء

صاحبزادہ امداد علی خاں امداد - شاگرد غفلت ولادت ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء متوفی ۱۰ر صفر ۱۲۸۲ھ مطابق جون ۱۸۶۵ء

صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیف - شاگرد بیمار و رسا - ولادت ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء متوفی رمضان ۱۲۷۹ھ مطابق نومبر ۱۸۶۲ء

سید نظام شاہ نظام - شاگرد بیمار و احمد ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء - متوفی ۲۵ر شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۲ء

سید احمد علی رسا - شاگرد بیمار - ولادت ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء متوفی محرم ۱۳۰۹ھ مطابق اگست ۱۸۹۱ء

صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب - شاگرد مومن - ولادت ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء متوفی ۲۹ر رجب ۱۳۰۰ھ مطابق ۶ر جون ۱۸۸۳ء

حشمت علی خاں موحد - شاگرد مومن - ولادت ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۰ھ آغاز بیسویں صدی تک حیات تھے۔

فتحیاب خاں اخگر - شاگرد غالب - ولادت ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء - ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حیات تھے۔

خورشید احمد مجددی خورشید - شاگرد غالب - ولادت ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء - ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حیات تھے

حکیم مظہر احسن خاں احسن - شاگرد غالب و اسیر ولادت ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء - ۱۸ر مارچ ۱۸۹۱ء

صاحبزادہ امیر اللہ خاں امیر - شاگرد شہیدی، بیمار، رسا - ولادت ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء - شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۲ء

سید محمد امیر شاہ امیر - شاگرد آشفتہ تلمیذ قائم - ولادت ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء - ۲۳ر صفر ۱۲۹۰ھ - اپریل ۱۸۷۳ء

محمد مظفر خاں گرم - شاگرد ذوق - ولادت ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء - ۱۰ر جمادی الآخر ۱۲۸۵ھ مطابق ستمبر ۱۸۶۸ء ساٹھ سال

---

[1] انتخاب یادگار و کلیات منیر مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۲ھ ص۲۱ — [2] تذکرہ کاملانِ رام پور - از حافظ احمد علی خاں ص۱۱ — [3] انتخاب یادگار - [4] نظم دل افروز معروف بہ دیوان تسلیم مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۰۳ء عرضداشت بحضور نواب حامد علیخاں ص۳۵۵ - تکریب دنہ سال سے بے خلوص شرف آبہ متصل حضور - [5] اسیر - خواجہ اسد صاحب متخلص بہ قلق کو ہمراہ لائے - تاج الاخبار ہفتہ وار رامپور ص۱۹ مطبوعہ ۳۱ر اگست ۱۸۷۵ء مطابق ۲۹ر رجب ۱۲۹۲ھ

مولوی محمد حیات خاں حیات - شاگرد ذوق - ولادت ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء - ۲۰ رمضان ۱۲۸۷ھ - دسمبر ۱۸۷۰ء

صاحبزادہ کرامت علی خاں کرامت - شاگرد کرم - ولادت ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء - رمضان ۱۲۸۹ھ مطابق نومبر ۱۸۷۲ء اٹھتر سال

متذکرہ بالا فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رام پور میں دہلی اسکول کا کامل اثر تھا اور مقامی شعرا دہلوی اور لکھنوی اسکولوں کی انحطاط پذیر شاعری سے بہت حد تک محفوظ تھے - مومن عہدِ نواب محمد سعید خاں میں رامپور آچکے تھے، غالب جنوری ۱۸۶۰ء میں بہ سلسلۂ استادیٔ ناظم پہلی بار رامپور آئے -

داغ دہلوی اول اول رام پور (آخر ۱۸۵۷ء) میں آئے، دہلی میں غدر سے پہلے اُن کی حیثیت نوخیز شعرا کی تھی، جہاں ذوق، مومن، غالب، آزردہ، شیفتہ وغیرہ کا سکہ چل رہا ہو وہاں نوجوان شعرا کو کون پوچھتا، نوخیز شعرا میں وہ ممیز ضرور تھے مگر ان میں سالک مجروح، ظہیر، انور وغیرہ بھی تھے جب یہ قلعۂ معلیٰ کی حدود سے نکلے تو قلعہ کی زبان اور تہذیب بھی ان کے ساتھ رہی، عوام وخواص میں جلد ہی گھل مل گئے، رام پور میں تنہا داغ ہی پناہ گزیں نہ تھے بلکہ حیا، ظہیر، انور دہلوی اور تسلیم لکھنوی بھی تھے بعد کو اس مجمع شعرا میں اضافہ ہوتا رہا، امیر، اسیر، منیر، عروج، تجر، ذکی، قلق وغیرہ بھی جمع ہوگئے، نواب یوسف علی خاں ناظم[1] ابتدا میں مومن کے شاگرد ہوئے اور بعدہٗ غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوگئے، جب روہیل کھنڈ میں آتشِ غدر فرو ہوئی اور امن وسکون ہوا تو انھوں نے اپنی غزلیں بھی مشاعروں[2] میں بھیجنی شروع کیں، داغ بعد غدر جس مشاعرہ میں شریک ہوئے وہ ناظم کے داماد[3] صاحبزادہ محمد رضا خاں کے مکان پر غالباً آغاز ۱۸۵۸ء میں منعقد ہوا تھا داغ نے یہ غزل پڑھی تھی ؎

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکّر میں چلے آتے ہیں،

اس درمیان میں ناظم نے بعد غدر امیر اور اسیر سے بھی اصلاح لی - منشی امیر احمد[4] امیر مینائی رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق اپریل ۱۸۵۹ء میں اپنے عزیز مولوی وجیہ الزماں خاں رحیق (خسر امیر مینائی ۱۸۶۰ء میں ہوئے) کی سفارش سے آئے اور مفتی عدالت دیوانی ہوئے - ۱۸۶۰ء میں مفتی طالب حسن ان کے بڑے بھائی آکر مفتی عدالت ہوئے اور امیر ۱۸۶۳ء میں رجسٹرار ہوگئے - امیر کی سفارش سے اسیر ملازم ریاست ہوئے -

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی شاگرد نسیم دہلوی ہنگامۂ غدر میں خیر آباد سے باغی افواج منتشر ہونے کے بعد رام پور آکر دس ماہ مقیم رہے تھے صاحبزادہ بخن خاں صاحب کے مکان پر مشاعرہ دسمبر ۱۸۵۸ء میں منعقد ہوا تھا، صدر مشاعرہ مرزا رحیم الدین حیا دہلوی تھے، حسرت[5] موہانی کا بیان ہے :- آپ رامپور کے سفر اول کے موقع پر .... مشاعرہ میں شریک ہوئے جس کے صدر مقام پر شہزادہ رحیم الدین خاں دہلوی کہ نواب یوسف علی خاں بہادر مغفور کے ہمنشین تھے نظر آئے، غم رکھتے نہیں، کرم رکھتے نہیں، طرح تھی آپ نے جوں ہی یہ مطلع پڑھا

یادگارِ ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں
صورتِ عمرِ رواں نقشِ قدم رکھتے نہیں

شہزادہ صاحب نے بے اختیار دادِ سخن دے کر پوچھا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں جب یہ علم ہوا کہ نسیم شاگرد مومن کے تو صاف کہہ دیا کہ وہی تو میں حیران تھا کہ لکھنؤ والے اس رنگ کو کیا جانیں وہاں تو انگیا کرتی کا مضمون خوب کہتے ہیں، نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں لکھنوی شعراء کو ترقی کے پورے ذرائع حاصل تھے، امیر اور اسیر نواب کے استاد تھے لیکن ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں ناظم کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں

---

[1] انتخاب یادگار - امیر مینائی ص۸ پہلے مومن خاں صاحب دہلوی سے مشورہ رہا - [2] داستانِ غدر ظہیر دہلوی ص۱۵۱ :- صاحبزادہ صاحب موصوف کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم آکر نواب (یوسف علی خاں) کی غزل اور اپنی غزل پڑھا کرتے تھے - [3] جلوۂ داغ، احسن مارہروی ص۲۳ - [4] سوانح عمری امیر مینائی - مؤلفہ ممتاز علی آہ ص۲۲ وآئینہ حسرت ص۸ مخطوطہ - مفتی طالب حسن مینائی بزرگ امیر ۱۲۷۶ھ میں رامپور آنا لکھتے ہیں - [5] "نگار" جون ۱۹۵۲ء ص۳۴ وعروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند تتمہ حصہ سوم ص۱۰۱، ۸ نومبر ۱۸۵۸ء مہدی حسن کو شکست مضمون دوبار رام پور ص۱۷

خلد آشیاں تخت نشین ہوئے اُنھیں اپنے اسلاف سے زیادہ مشاہیر ہند کے جمع کرنے کا شوق رہا۔ اب منیرؔ، عروجؔ، بحرؔ، قلقؔ وغیرہ بھی جمع ہوگئے۔ شمس العلماء مولوی عبدالحق خیرآبادی، میر عوض علی عدیلؔ خوشنویس، حکیم محمد ابراہیم لکھنوی وغیرہ ہر فن کے باکمال دربار رام پور میں آگئے اس سلسلہ میں خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی کا بیان[1] دربار میں لکھنوی تفوق کو ظاہر کرتا ہے:-

"نواب مخزن الدولہ بہادر فرماتے ہیں کہ نواب کلب علی خاں کے دربار میں ہم مدت تک رہے ہم اس کے برابر علمی اور ادبی حیثیت سے کسی ریاست کو نہیں سمجھتے، حق تو یہ ہے کہ رئیس شریف پرور تھا۔۔۔۔ مچھی بھون کے قلعہ میں دربار ہوتا تھا اور گول گھر میں نواب کا نواڑی پلنگ طلائی پاؤں کا بچھا ہوتا تھا اس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے گرمیوں میں محض ابری کے چوکے پر اور جاڑوں میں دری چاندنی، اونی قالین کے فرش پر درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ نواب کے داہنی طرف نواب حیدر علی خاں بہادر۔ نواب امداد الدولہ۔ نواب مفتاح الدولہ اور حقیر، اُسکے بعد نادر شاہ خاں صاحب، عبداللہ خاں صاحب، بائیں طرف اصغر علی خاں صاحب بہادر۔ منشی منیرؔ۔ آفتاب الدولہ قلقؔ۔ منشی امیر احمد اور کوتوال شہر دست بستہ چوبدار کھڑے ہوتے تھے ڈیوڑھی کے اندر شاہی قاعدہ کے موافق لال پردہ باناتی پڑا ہوتا تھا سلام کرانے کو مردھا ساتھ آتا تھا۔"

گو یہاں لکھنوی شعرا کو عروج حاصل تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اُستادانِ لکھنؤ نے نواب کلبِ علی خاں کی پوری حمایت کے باوجود میدانِ سخن میں شکست تسلیم کرلی، داغؔ[2] دہلوی کی یہ جیت رام پوری اسکول شاعری کے باعث ہوئی۔

لکھنوی اور دہلوی اسکولوں کی بحث بڑی دلچسپ ہے، حامیانِ لکھنؤ اپنی فتح بتاتے ہیں اور دہلوی حضرات اپنی جیت قرار دیتے ہیں۔ رام پوری شعراء اور رام پوری بامذاق سامعین دونوں فریقوں کی نظر سے غائب رہے، یہ بحث نواب کلبِ[3] علی خاں کے دربار میں بھی ہوتی تھی کہ دہلوی زبان بہتر ہے یا لکھنؤ کی، دونوں فریقوں کے شاگردوں میں بھی نوک جھونک جاری رہتی، بہرحال فیصلہ مشاعرہ میں ہوتا جہاں خواص اور عوام دہلوی اسکول کے نمایندہ داغؔ دہلوی کو قبولیت عام کا سرٹیفکٹ عطا کرتے۔ اب احسن صاحب کی رائے اس ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:-

"ہم نے بعض ناواقفوں کے ایسے خیالات فاسد بھی سُنے ہیں کہ مرزا صاحب نے رام پور میں رہ کر اور شعرائے لکھنؤ کی صحبت پاکر اپنے اسلاف اور اپنے شہر کی طرز چھوڑ دی اور بالکل لکھنؤ کے مقلد ہوکر، وہیں کی بندشیں وہیں کے چوچلے، وہیں کے استعارے غرضکہ وہیں کی روش اختیار کرلی ہے۔۔۔۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جس اہلِ زبان اور زبان داں نے ابتدائے عمر سے ۳۰ - ۳۲ برس تک اپنی جگہ پر مشقِ سخن کی ہو وہ دوسری جگہ جاکر یکایک اپنی مادری زبان سے ایسا ناآشنا ہوجائے کہ اپنے مقلدوں کی تقلید کرنے لگے بفرض محال اگر یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے تو یہ بات دکھانی چاہیئے کہ مرزا صاحب نے اہلِ لکھنؤ کی کیا پیروی کی ہے اور کس قسم کی تقلید فرمائی ہے کیا رام پور جانے سے پہلے جس طرز میں مرزا صاحب فرماتے تھے اُس کے خلاف طرز اختیار کی یا لکھنؤ کے مخترعات و تصرفات اپنے کلام میں داخل کرلئے۔۔۔۔ ناسخؔ نے جدت کی لیکن دہلی نے تقلید نہیں کی، تمام اہلِ دہلی اپنی اپنی جگہ قدیم و جدید سب محاورے استعمال میں لاتے رہے ثقات شعرا میں اس کا زیادہ لحاظ رہا اور وہی وقتاً فوقتاً ترمیم اور متروک کرتے رہے!"

اب حامیانِ لکھنؤ اسکول کی سنئے لطیف احمد[5] اخترؔ مینائی خلف امیرؔ لکھتے ہیں!-

دربار رام پور

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیرؔ کے دیوان دوم کا جو رنگ ہے وہ پہلے دیوان کا نہیں ہے اور اُس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ دربار رام پور میں اجتماع شعرا ہونے سے اہلِ دہلی کا اہلِ لکھنؤ پر اثر پڑا اور حضرت امیرؔ نے داغؔ کا رنگ اختیار کیا یہ کہنا

---

[1] رسالہ زمانہ جولائی ۱۹۱۳ء — [2] جلوۂ داغ ص۲۰۲ امیرؔ کا یہ مقولہ شائع ہے کہ وہ کلام پسندیدہ ہے جو مشاعرہ سے باہر جائے۔۔۔۔ اُنھیں کا قول تھا کہ میں نے اکثر مرزا داغؔ ہی کا شعر باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

[3] خمخانۂ جاوید جلد سوم - ص۱۱۱ بحث تذکیر و تانیث سائنس — [4] جلوۂ داغ صفحات ۲۴ تا ۲۹

[5] سوانح عمری امیر مینائی - الجلیل صفحات ۲۷ تا ۳۰

صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ دربار رام پور میں بعہد نواب خلد آشیاں لکھنؤ کے شعرا بہ کثرت موجود تھے اسیر، امیر، جلال، بحر، قلق، منیر، ذکی، عروج، تسلیم، شرف، جان صاحب وغیرہ اور دہلی کے صرف فصیح الملک داغ تھے اور ایک صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا[1] تھے جن کی کوئی نمود نہ تھی فطرت کا مقتضا ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں رہتا ہے اُسی رنگ میں رنگ جاتا ہے نسیم دہلوی کا رنگِ شاعری اس کا شاہد ہے جو لکھنؤ میں جاکر رہے تھے اسی طرح رام پور کی زبردست سوسائٹی کا اثر داغ پر ہونا لازم تھا، اور ہوکر رہا خصوصاً حضرت امیر کی صحبت سے جناب داغ نے معتدبہ فایدہ اُٹھایا، زبان کی صفائی میں کلام کی چستی اسی کا نتیجہ ہے، دہلی کی شاعری قابلِ تعریف مسلّم، مگر اُس میں صفائی نہیں ہے، مضامین اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمک جاتے ہیں بخلاف اُس کے لکھنؤ کی شاعری ایسی ہے جہاں روشنی ہی روشنی ہے ---- نواب خلد آشیاں لکھنؤ کی زبان اور شاعری کے دلدادہ ہی نہ تھے بلکہ اس میں اُن کو انتہا کا غلو تھا سوا شعرائے لکھنؤ کے کسی کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اُن کے دربار میں دلّی کی شاعری کا ذکر جرم سمجھا جاتا تھا ---- مرزا داغ کو زمرۂ شعرا میں نہیں رکھا بلکہ ریاست کے بعض کارخانوں پر مامور فرمایا تھا، انتہا یہ ہے کہ نواب صاحب نے حضرت امیر ایسے بے نفس اور صلح مشرب کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہے

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے،

دیوان دوم محض ایک رنگ میں ہے اور دیوان اول میں بمقتضائے دورِ ناسخ اور رنگ کے اشعار بھی ہیں - مولانا عبداللہ العمادی نے سوانح عمری امیر[2] (مؤلفہ ممتاز علی آہ) کے دور میں اساتذۂ دہلی کے کلام پر تنقید کرکے دل کی بھڑاس نکالی ہے"۔

بات اتنی ہے کہ داغ نے لکھنؤ سے سیکھا یا امیر نے داغ کی تقلید کی یہ دونوں حضرات اس مسئلہ میں خاموش رہے لیکن انکے حامیوں میں ادبی جنگ جاری ہوگئی مکاتیب[3] امیر کے مقدمہ میں احسن اللہ خاں ثاقب نے محاکمہ کیا ملاحظہ ہو :-

"جناب امیر کو اگرچہ مرزا داغ کے مقابلہ میں شہرت کم ہوئی لیکن معنی یاب طبایع میں اُنھیں کا کلام مقبول ہوا، دیوان اول اسیر و ناسخ کے رنگ میں ہے ---- حضرت کی طبیعت میں جدت کم ہے اور کلام میں سوز و گداز بھی، البتہ شکوہ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی وہ اصنافِ سخن میں قادر اور استاد ماہر ہیں قصائد باشوکت و فر ہیں اور سخنور باسرمایہ صاحبِ علم و فضل ہیں داغ ان اوصاف سے معرّا ہیں ---- آخر عمر میں استاد نے داغ کا رنگِ کلام اور قبول عام کو دیکھ کر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے تاہم صنمخانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہونچی، یہ واقعی بات ہے کہ امیر کی استادی میں کلام نہیں کرسکتا، لیکن اسیر کا تلمذ، اساتذۂ لکھنؤ کی ہم بزمی، اہل لکھنؤ کے کلام کا پیشِ نظر رہنا، پھر لکھنؤ کی صحبت کا اثر یہ سب امور مانع ترقی و کامیابی ہوئے اگر وہ دلّی میں پیدا ہوتے، دلّی کے اربابِ کمال کی ہمنشینی میسر آتی، اساتذہ دہلی کا کلام سامنے رہتا اور شاہجہاں آباد کی سوسائٹی سے مستفید ہوتے تو وہ سخنور بے مانند اور استاد ارجمند ہوتے ---- مرزا داغ مرحوم کی شوخ طبیعت نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کو غزل کی جان اور اُردو شاعری کی روحِ رواں کہنا سراسر انصاف ہے"۔

ثاقب کے محاکمہ میں اگرچہ غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی داغ مرحوم کی شاعری کو سرمایۂ ادبی جذبات و خیالات کہنا ناانصافی ہے۔

---

[1] گلستانِ سخن - مرزا قادر بخش صابر ص۲۰۲ :- مرزا رحیم الدین حیا ... سبحان اللہ سخن اعجاز سے ہم پہلو اور معنی سحر سے دوبدو .... دلنشینی سخن ایسی کہ ہنوز لب سے آشنا نہیں ہوا کہ طبیعت سامع میں جا بیٹھا۔ ص۸۲ داستانِ غدر میں انکے متعلق ظہیر دہلوی لکھتے ہیں :- کہ انکا کلام پایۂ استادی سے ہم پایہ تھا۔ [2] سوانح امیر مقدمہ ص۹ - [3] مکاتیب امیر طبع ثانی۔ مطبع ادبیہ لکھنؤ ۱۹۲۴ء صفحات ۵۴ تا ۵۶

لکھنؤ اور دہلی اسکول کی آخری نمایندگی شہرتِ عام اور میلانِ خواص کی بنا پر انشار، رنگین، ناسخ، آتش اور شاہ نصیر پر منحصر تھی لیکن خواص میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو اس بگڑے ہوئے مذاق کو پسند نہیں کرتا تھا۔ مصحفی[1] نے ناسخ اور نصیر دونوں کے رنگِ سخن پر تنقید کی ہے۔

مصحفی کا ناسخ اور متبعانِ ناسخ پر یہ اعتراض کہ غزل کو قصیدہ بنا دیا صحیح ہے۔ واردات عشق و محبت کے لئے شیریں لہجہ اور سوز و گداز ہونا ضروری ہے لیکن تلاش معانی تازہ میں غزل کا حُسن جاتا رہا، رہے شاہ نصیر تو انھوں نے آبرو اور ناجی وغیرہ کے ڈھنگِ سخن کو دوبارہ حیاتِ نو بخشنا چاہی لیکن ممنون، آزردہ، مومن، غالب وغیرہ کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا اور دہلی کی شمع سخن روشن ہی رہی۔

لکھنؤ میں سوز اور سودا پہلے پہونچ چکے تھے لیکن سودا نے عمر کا باقی حصہ بھی قصیدہ گوئی اور ہجو نگاری میں گزار دیا اور لکھنؤ میں اپنا کوئی جانشین نہ چھوڑا، سوز کی طرز آصف الدولہ کی استادی کے باوجود بھی لکھنؤ پر گہرا اثر نہ ڈال سکی۔ ۱۱۹۶ھ[2] میں میر بھی دہلی سے پہونچ گئے اور ۱۱۹۸ھ[3] میں مصحفی نے بھی مستقل سکونت لکھنؤ کی اختیار کرلی۔ لیکن میر کی خلوت پسند طبیعت کے باعث عوام تو درکنار خواص بھی اُن کے فیضِ سخن سے محروم رہے۔ حسرت سے زیادہ اُس کے شاگرد جرأت نے اس عہد میں شہرتِ عام حاصل کی، میر حسن مثنوی کے اہل قرار پائے غزل میں وہ بھی کوئی اثر نہ پیدا کرسکے، انشاء کو ہر رنگ میں کہنے کا دعویٰ تھا لیکن اُن کی ہمہ دانی بھی خلعت قبولیتِ عامہ نہ دلاسکی، مصحفی[4] جو اپنی زندگی میں قایم سے متاثر نظر آتے ہیں اُنھوں نے جرأت کا بھی مقابلہ کیا اور انشار کا بھی اُن کے شاگرد بسر طبقہ میں تھے مگر جرأت کی سی مقبولیت نصیب نہ ہوسکی جو امیروں کی بزم میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور عوام کا بھی محبوب شاعر تھا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ میر اور سودا، درد اور سوز، قایم اور یقین نے جو سوسائٹی پائی تھی وہ کہاں میسر آسکتی تھی مرزا مظہر جان جاں اور سراج الدین علی خاں آرزو کی سرپرستی اور رہنمائی میں ریختہ گوئی نے معراج کمال پائی، ان میں سے ہر ایک حافظ و فغانی، کلیم و صائب، طالب و بیدل ریختہ گوئی میں تھا ان کے سامنے فارسی اساتذہ کا کلام تھا اور مبصر آرزو اور مظہر جیسے تھے، مصحفی، انشا، جرأت، رنگین وغیرہ کو یہ بات کیسے میسر آسکتی تھی ہر ایک نے اپنا رنگ علٰحدہ پیدا کیا، جرأت کی طبیعت میں شوخی تھی اُسنے دہلی کی اُردوئے معلّٰی میں واردات عشق و محبت کی ترجمانی سوسائٹی کی صحیح عکاسی کے ساتھ کی، عوام و خواص نے سر آنکھوں پر جگہ دی میر نے اس چوما چاٹی کو پسند نہیں کیا یہ میر کی پسند تھی، مصلحت یہ تھی کہ مختلف طرزوں میں سے کوئی ایک طرز پسند کی جاتی، قایم چاند پوری مولد رام پوری مسکن و مدفن نے اپنے شاگرد شاہ کمال کمالؔ کو صحیح رائے دی "میاں شاہ[5] قلندر بخش جرأت درسخن سنجاں نظیرے و در معنی آفرینیاں عدیلے ندارد"۔۔۔۔ مصحفی نے بھی بہت جلد اپنا اعتبار لکھنؤ میں پیدا کرلیا، میر نے ان کے شعر پر داد دے کر معاصرین میں ہمت افزائی کی، ان کا رنگِ سخن دہلی اسکول ہی کا ترجمان رہا۔ اب تک دہلی اُجڑ رہی تھی اور لکھنؤ بس رہا تھا، شاہ عالم کا زوال حکومت، اودھ کی ریاست کے لئے باعثِ فروغ رہا، پہلے دہلی کا ہر متوسل اودھ میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا لیکن دہلی کے مسلسل انحطاط سے حکومت اودھ نے فایدہ اُٹھایا اور نواب سعادت علی خاں کے عہد میں اس کا چرچا دربار میں بھی ہونے لگا۔۔۔۔
"دریائے لطافت[6]" لکھ کر انشا نے لکھنوی اسکول کی مستقل بنیاد رکھدی، میر اور سوز کی زبان غیر فصیح قرار دی گئی، دہلوی مولد ہونا بھی

۱؎ ریاض الفصحا۔ صفحات علی الترتیب ۲۴۵ و ۳۲ و ۲۴۴ و ۳۲۷ — ۲؎ ذکرِ میر۔ ص ۱۳۹ بمجرد دیدن خط برخاستم و روانہ لکھنؤ شدم۔

۳؎ عقد ثریا۔ مصحفی ص ۱۳۱ در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت صعوبت سفر کشیدہ از شاہجہاں آباد در لکھنؤ رسیدہ۔

۴؎ تذکرہ ہندی۔ ص ۲۰۱ در پختگی کلام و چستی مصراع غزل و رویۂ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استادی می رود بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید۔ ۵؎ مجمع الانتخاب دیباچہ (مخطوطہ انجمن ترقی اردو ہند) مولفہ شاہ محمد کمال کمالی شاگرد قایم و جرأت

۶؎ دریائے لطافت۔ طبع مراد آباد۔ صفحات ۱۲ تا ۲۲

قابلِ اعتماد نہ رہا۔ زبان دانی کا معیار برائے نام قلعۂ معلّیٰ دہلی اور دو ایک محلے قرار پائے لیکن غازی الدین خاں عماد الملک باوجود اپنے علم وفضل اور سکونت دہلی کے نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے روبرو جاہل، اور خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جان جاناں فصحائے دہلی باوجود دہلوی مولد اور مسکن ہونے کے ناقابلِ اسناد قرار پائے البتہ باخبر جوانانِ اودھ کی زبان بمقابلہ اہالیان دہلی مقیم لکھنؤ مستند قرار پائی۔

اب کیا تھا نوخیز شعرائے لکھنؤ نے ناسخ کی قیادت میں دہلی سے علم بغاوت بلند کیا، الفاظ کی تراش خراش شروع ہوئی۲، بجائے سوز و گداز کے غزل میں مضامین بلند اور معانی تازہ نے دخل پایا اور معشوق کے خارجی اوصاف لباس و سرمہ، مسی، محرم، موباف، دوپٹہ اور چشم ولب و دہن و بازو وسینہ سے گزر کر نازک مسایل وصال تک معیارِ سخن بلند ٹھہرے، شاہ حاتم، سودا، میر، یقین، مظہر، درد، سوز، قایم ایہام کی بھول بھلیوں سے نکل کر جو معیارِ سخن قایم کر چکے تھے وہ مسترد ہوا اور پھر رعایت لفظی پر معانی نازک ولطیف قربان ہونے لگے۔

جرأت و میر (وفات ۱۲۲۵ھ) رخصت ہو گئے تھے، انشا و مصحفی تماشا دکھانے والوں میں تھے اور مصحفی خود تماشا تھے جو اس جدید بزمِ سخن کو دیکھتا، مرعوب ہو جاتا، شاہ نصیر لکھنؤ آکر قفس کی تیلیوں میں پھنس گئے مگر دہلی کو اس بگڑتی ہوئی حالت میں میر نظام الدین ممنون خلف قمر الدین منت نے سنبھالا (متوفی ۱۲۶۰ھ) ان کے شاگرد مفتی صدر الدین آزردہ کا مکان دہلی کے علماء اور ادبا کا مرکز تھا یہیں بیٹھ کر غالب نے طرز بیدل میں ریختہ سے توبہ کی اور یہیں مومن نے..... عشق و محبت کے مضامین کو معانی بیگانہ میں ادا کرنے کی روش ممنون کی روش پر پیدا کی، مومن کے شاگرد شیفتہ اور تسکین دہلی میں صفِ اول میں شمار ہوتے تھے اور عباس علی خاں بیتاب رامپوری بھی نوجوان خوش گو شعرا میں داخل تھے، داغ نے کمیِ تعلیم کے باعث غالب و مومن کی پیروی دشوار سمجھی، رہی زبان سو وہ انھیں قلعۂ معلّیٰ سے تحفہ میں ملی تھی، عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں عالمِ طفلی سے اُن کی نظروں سے گزر رہی تھیں، سوسائٹی کا یہی رنگ رامپور میں قایم تھا۴ نواب کلب علی خاں موسیقی کے دلدادہ تھے ان کے دربار میں طوائفیں بھی تھیں اور موسیقی کے ماہرین بھی، داغ نواب کلبِ علی خاں کے ملازم ہی نہ تھے بلکہ مصاحب خاص بھی تھے، حج کے بعد بھی ایسے مشاغل سے دست کشی نہ نواب صاحب نے اختیار کی نہ داغ نے، داغ اپنے احباب اور شاگردوں سے برادرانہ ملتے تھے، حجاب کی داستانِ عشق۵ میں اُن کے رازدار اور چارہ گر شاگرد بھی تھے۔

میاں نظام شاہ نظام جو رنگ جرأت کے خاتم ہیں اُن کا رنگ کلام اور قبولیت عام فصیح الملک کی صحیح رہبر تھی، احمد علی رسا شاگرد بیمار رام پور میں امیر مینائی کے مدمقابل تھے انتخاب یادگار میں رسا اور امیر کے شاگردوں کی تعداد مساوی ہے وہ لکھنؤ اسکول کے فریقِ مخالف اور رامپوری اسکول کے ترجمان تھے (جو دہلوی اسکول شاعری کی شاخ ہے) فصیح الملک نے اپنی علمی کمی کو مولوی ولی محمد خاں بسمل رامپوری سے پورا کیا تھا۔ در اصل رام پور میں مقابلہ داغ اور لکھنوی اساتذہ کا نہ تھا بلکہ مقابلہ لکھنوی اسکول اور رام پوری اسکول کا تھا۔ صاحبزادہ مہدی علی خاں خفیف شاگرد بیمار و رسا رام پوری، نواب احمد علی خاں رند کے داماد شوہر شمسہ تاجدار بیگم تھے۔

---

۱ گلشنِ بے خار۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء ص۱۸۱ ۲ اعتقاد من روزے کہ بے شرف مجالست ایشاں بپایاں آید داخل ایام عمر ہست۔ ۳ اخبار الصنادید جلد ۲ صفحہ ۱۰۲۔ ۴ مغنیوں کے سوا ایک گروہ طوائفوں کا تھا جن سے نواب صاحب کے جلسوں کی زینت تھی۔ ۵ مثنوی فریاد داغ ص۲۷۔
"میرے غمخوار جاکے لائے انھیں ٭ بنی کچھ بغیر آئے انھیں" ۶ ص۸۱ پٹنہ اسٹیشن پر سے "مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے ٭ میرزا شاغل آئے جب وہ پٹے"
۷ کمال داغ۔ پروفیسر حامد حسن قادری ص۸ مقدمہ۔ شعرائے رام پور سے داد لینی تھی۔ ۸ سوانح عمری امیر مینائی۔ از جلیل ص۳۳ شہر میں یوں تو اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے مگر ایک مشاعرہ خاص صاحبزادہ مہدی علی خاں کے یہاں مسلسل ہوتا تھا۔ وہ مشاعرہ سرکاری کہا جاتا تھا جو خاص امیر کی نگرانی میں منعقد کیا جاتا تھا۔

اُن کی باقاعدہ ریاست سے مقدمہ بازی رہی کہ حق ریاست شمسہ تاجدار بیگم کا ہے، ان کے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی بہت سیرچشم رئیس تھے ان کے بیٹے صاحبزادہ محب علی خاں عرف ننا صاحب سے بھی مقدمہ بازی رہی، اسی طرح صاحبزادہ کاظم علی خاں اور صاحبزادہ حیدر علی خاں سے نزاع رہا، غرض گھر گھر مسند ریاست بچھی تھی جہاں مقامی شعرا کی پرسش ہوتی اور رائے عامہ آزاد تھی۔ سید احمد علی رسا اور سید نظام شاہ نظام رام پوری شاگردان بیمار جرم ہم وطنی میں ماخوذ ہوکر دربار سے دور رہے، ان کی پوچھ گچھ مقامی رؤسا اور خاندانی کرتے، نظام کو سواروں کی ملازمت میں اتنے پیسے بھی ہاتھ نہ آتے تھے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کرسکتے اصغر علی خاں جنرل فوج رام پور سے استدعا کرنے پر مجبور ہیں[۲] ؎

اُدھر ہے یہ اجازت ہمتِ عالی کی کہہ مطلب   اِدھر مانع حیا دشوار دل میں آرزو لانا
مگر کیا کیجئے شادی ہے اس عاجز کی بیٹی کی   عنایت ہو تری تو سہل ہے اس غم سے چھٹ جانا

مدارالمہام محمد عثمان خاں (متوفی ۱۲۹۰ھ) سے استدعا کرتے ہیں کہ اسامی اسپ سرکار سے ملی ہے مگر رقم خریداری اسپ میرے پاس نہیں ہے دس روپے قدیمی تنخواہ ہے رقم جو سود پر مل رہی ہے وہ پہلے قرضہ سے سود وضع کرنا چاہتے ہیں ؎

جمع سے سود کاٹنا اندھیر   حق نہ دکھلائے ایسی تو دو کاں
قرض کل مجھ پہ تین سو پچاس   اور جو کچھ سود ہو سوائے آں

داغ شعرائے دربار رام پور سے متعلق تھے وہ منکسر المزاج، ملنسار اور زمانہ کا گرم و سرد دیکھے ہوئے تھے، وہ نواب کلب علی خاں کے استاد نہ تھے مصاحب تھے، وہ مفتی عدالت نہ تھے بلکہ کارخانجات ریاست کے افسر تھے جس کا تعلق شاگرد پیشہ یا عام طبقۂ آبادی سے تھا وہ فراش خانہ میں بیٹھ کر سرکاری کام کرتے، احباب سے ملتے اور شاگردوں کو اصلاح بھی دیتے، اُن کے مکان پر ہر کس و ناکس بلاتکلف آسکتا تھا۔

لکھنوی شعرا خواہ اسیر ہوں یا منیر، تجر ہوں یا قلق، عروج ہوں یا امیر معقول مشاہرہ پاتے، ان میں سے ہر ایک ایکسو روپیہ ماہوار یا اس سے زیادہ مشاہرہ کسی خدمت یا شاعری کے نام پر پاتے، اودھ کی حکومت کی بہار دیکھے ہوئے تھے رام پور جیسی غریب بستی کے لوگ ان کی نظروں میں کیا جگہ پاتے ہاں جو ان سے قریب ہوا وہی آگے بڑھا، منشی امیر اللہ تسلیم تیس چالیس روپے سے آگے نہ بڑھ سکے اپنے شاگردوں کے مکانوں پر مقیم رہے شہر میں عام شناسائی کے بدولت یہ بھی عوام کے شاعر رہے اور شہرت پائی جلال اپنے شاگرد محمد شاہ خاں کاوش کے مکان پر رہتے تھے اس لئے زیادہ عوام سے قریب رہے، یہ بھی لکھنؤ سے ہٹ کر چلنے پر مجبور ہوئے اور جتنا عوام سے دور رہے اتنا ہی قبولیت عام سے محروم رہے اگر امیر مینائی داغ کے ہمنوا نہ ہوتے تو اسیر اور منیر، عروج وغیرہ کی طرح گمنام ہو جاتے لیکن داغ کی ہندوستان گیر شہرت دیکھ کر اپنا رنگ سخن بدلنا ہی پڑا، داغ کے طرفدار رام پور کے تمام عوام و خواص تھے اور لکھنوی شعرا کے حامی و مددگار رئیس وقت، نتیجہ یہ ہوا کہ جیت داغ کی رہی، ہر چند داغ کی تماش فراش، لکھنؤ میں زیادہ ہوئی اور دہلی میں کم مگر محاورات اور روزمرہ میں لکھنؤ دہلی کا مقابلہ نہ کرسکا، اور داغ کی کامیابی کا یہی راز تھا۔

کلب علی خاں فایق رامپوری

---

[۱] اخبار الصنادید جلد دوم۔ صفحہ ۱۱۵ و صفحہ ۲۰ نواب یوسف علی خاں کو ایام غدر میں محافظ "گرشتان" کہتے اور چارج میں دے کر پہرہ کی تبدیلی کرتے۔ صفحہ ۵۱۹ مولوی غلام جیلانی خاں رسالدار نے نواب فیض اللہ خاں سے کہا کہ کل اس گدی پر آپ نہ ہوں گے یوسف ہوگا مسند ہوگا (افغانی قبائل) — [۲] کلیات نظام مطبوعہ صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱

وادیِ کشمیر کی تاریخ پر سرسری تبصرہ

اس وقت کشمیر نے ہندوستان و پاکستان کے درمیان نزاعی مسئلہ کی صورت اختیار کرکے بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے تاریخی حالات مختصراً قلمبند کردئے جائیں جن سے اکثر حضرات ناواقف ہیں

(ادارہ)

وادیٔ کشمیر سے وہ جھیلوں والا حصۂ زمین مراد ہے جسے دریائے جہلم اور اس کے باجگزار دریاؤں (خصوصاً دریائے سندھ اور لیدر) نے انسانی آبادی اور کاشت کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

یہ وادی کب اور کیونکر آبادی کے قابل ہوئی، اول اول یہاں کونسی قوم آباد تھی، کس کی حکومت تھی اور یہاں کے موسمی حالات میں آہستہ آہستہ کیا تغیرات رونما ہوئے، اس کا علم ہمیں حاصل نہیں، لیکن پچھلے دو ہزار سال کا حال جو کچھ معلوم ہوسکا ہے وہ یقیناً تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

جن ذرایع سے کشمیر کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے ان میں سب سے زیادہ اہم کلہان کی راج ترنگینی ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور جسے اسٹین (Stein) نے اپنے ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔ دوسرا ذریعۂ معلومات چینی سیاح یوان چوانگ کے بیانات ہیں یہ سیاح ساتویں صدی عیسوی میں کشمیر آیا تھا۔ اس کے علاوہ البیرونی کی کتاب، ابوالفضل کی آئینِ اکبری تزک جہانگیری اور اورنگ زیب کے فرانسیسی طبیب برنیر کے بیانات سے بھی یہاں کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ان ذرایع کے علاوہ دوسرا ذریعۂ معلومات یہاں کے قایم دریافت شدہ سکے ہیں جن سے چھٹی صدی عیسوی سے لیکر عہد مابعد تک کے بہت سے افتخالی، ہندو، مسلمان اور سکھ بادشاہوں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

وادیٔ کشمیر کی یہ خصوصیت کہ دنیا کے بڑے بڑے مشہور فاتحین میں سے کسی کی رسائی یہاں تک نہ ہوسکی، نہایت عجیب خصوصیت ہے۔ اسکندر اعظم، چنگیز، تیمور، بابر میں سے کسی کے قدم یہاں نہیں پہونچے، محمود غزنوی نے بیشک ایک بار ادھر کا رخ کیا تھا لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔

بطلیموس سے قبل کوئی کلاسکل ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے کشمیر کے حالات پر روشنی پڑتی ہو، کیونکہ سکندر اعظم کے عہد کے مورخین نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔

سب سے پہلے بطلیموس نے دوسری صدی عیسوی میں بتایا کہ کشمیر میں ایک بڑی زبردست حکومت قایم ہے جو حدود وادی کے علاوہ دور دراز حصوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بطلیموس نے جس حکومت کا ذکر کیا ہے وہ حقیقتاً کوشانوں کی حکومت تھی جو اس وقت شمالی ہند تک وسیع تھی۔

وہ اس کا نام کیسپریا لکھتا ہے (یہی لفظ بعد کو کشمیر ہوگیا) اور چونکہ اس کی جائے وقوع وہ جہلم، چناب اور راوی کے منبعوں کے نیچے بتاتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ وادی کشمیر کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا)

اس سے قبل کے حالات کا زیادہ صحیح علم نہیں تاہم یہ یقین کرنے کے اسباب موجود ہیں کہ مسیح سے ۲۵۰ سال قبل کشمیر اشوک کی حکومت میں شامل تھا۔

چندر گپت (اشوک کے دادا) نے سکندر اعظم کے نائب سلیوکس کو شکست دیکر ایک بہت بڑی حکومت قایم کرلی تھی اور جب اشوک نے بودھ مذہب اختیار کیا تو اس وقت کشمیر بھی اس کی قلمرو میں شامل تھا۔ ہر چند وادی کشمیر میں اشوک کے ستون یا لاٹ (جن پر اس کے احکام منقوش ہوتے تھے) اس وقت تک دستیاب نہیں ہوئے، لیکن مانسہرہ اور ہزارہ کی وادی میں ضرور اس کا پتہ چلتا ہے اور یوانگ چوانگ چینی سیاح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وادیِ کشمیر میں بھی اشوک نے بودھ کی یادگار میں چار اسٹوپا قایم کئے تھے۔ اس کی تصدیق راج ترنگنی سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ اشوک نے یہاں متعدد اسٹوپا تعمیر کئے تھے اور ایک شہر سری نگری کے نام سے قایم کیا تھا (جو موجودہ سری نگر سے تین میل دور پانڈرتھان مندر کے چاروں طرف آباد تھا)

اس کے بعد کنشک، ہشک اور جشک تین فرمانرواؤں کے زمانہ کی روایات زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ چینی اور بودھی ذرایع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کنشک کے ایک بہت بڑا اجتماع بودھ مذہب والوں کا کیا تھا جس کا زمانۂ انعقاد بودھ کے ۴۰۰ سال بعد (یعنی قبل مسیح پہلی صدی میں) میں قرار پاتا ہے۔

کوشان خاندان کی حکومت کو جب زوال آیا تو یہاں کی حکومت مختلف چھوٹے چھوٹے سرداروں میں بٹ گئی یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی میں افتھالیوں (سفید فام ہن Huns) نے اس پر قبضہ کرلیا۔

اس قبضہ کی داستان یہ ہے کہ افتھالیوں نے پہلے مغرب کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور ان کا فرمانروا مہراگولا ۵۲۰ء میں سیالکوٹ پر قابض ہوگیا تھا جب چینی سیاح سونگ یون یہاں آیا تو مہراگولا نے کشمیر پر چڑھائی کر رکھی تھی لیکن یہ مہم غالباً ختم نہ ہوئی تھی کہ وسط ہند میں اس کو شکست ہوئی اور اس کے بعد اس نے کشمیر میں اپنے پاؤں آہستہ آہستہ جمالئے۔ اس کے بعد اس نے اپنے بھائی پر حملہ کیا جس نے اس کی راجدھانی گندھارا (قندہار) پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس مہم میں مہرگولا کو ناکامی ہوئی اور اس کے بھائی کے فوجی افسر یسودھرمن نے اس کا تعاقب کشمیر تک کیا اور اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مہراگولا کی حکومت کشمیر میں بدستور قایم رہی کیونکہ اس کے دو جانشینوں (لکھن گلا اور تورمان) کے نام کے سکے کشمیر میں پائے گئے ہیں۔

یوان چوانگ کا بیان ہے کہ مہراگولا ظالم فرمانروا تھا اور بودھ مت والوں کو بہت ستاتا تھا۔ یہ چینی سیاح مہراگولا کے زمانہ میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے بعد غالباً درلابھا کے زمانہ میں آیا تھا جو کارکوٹک خاندان کا بانی تھا اور جس کے عہد میں ۱۰۰ خانقاہیں بودھ مت کی یہاں پائی جاتی تھیں۔ اس کے تھوڑے زمانہ بعد ہی راجہ ہرش (والی قنوج) نے کشمیر پر حملہ تو نہیں کیا لیکن بودھ مت کا دانت جو یہاں ایک خانقاہ میں محفوظ تھا حاصل کرلیا۔

ساتویں صدی میں چین و کشمیر کے تعلقات زیادہ گہرے رہے یہاں تک کہ چین اور کشمیر کے درمیان سفارتی تعلقات قایم ہوگئے جو ۷۵۹ء تک باقی رہے۔

کارکوٹک خاندان کے عہد حکومت میں چین کا جو سفارتی مشن ۷۱۳ء میں آیا تھا وہ راجہ کندر پیڈا کے طلب کرنے پر آیا تھا اور مقصود یہ تھا کہ محمد قاسم کی طرف سے جو اندیشہ حملہ کا پیدا ہوگیا تھا اس میں چین کی مدد حاصل کی جائے۔ (محمد قاسم ہمالیہ کے دامن تک پہونچ گیا تھا لیکن آگے بڑھ کر کشمیر پر حملہ کرنے کی نوبت نہیں آئی)

اس خاندان کی حکومت ابتدا میں پکھل، پونچھ، راجہ پوری، ٹکسلا اور سالٹ رینج تک وسیع تھی لیکن بعد کو ان حدود میں کمی ہوتی رہی تاہم چودھویں صدی عیسوی تک اس خاندان نے کشمیر میں حکومت کی اور اس کے بعد مسلمان آئے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں گندھارا میں ہندو خاندان ساہی کی حکومت علحدہ قایم تھی اور کشمیر میں کارکوٹک خاندان کی علحدہ

اور یہ دونوں ایک دوسرے کی حریف تھیں، لیکن چونکہ اب مسلمانوں کے اقدامات شروع ہوگئے تھے اس لئے کشمیر اور گندھارا کی حکومتوں میں اتحاد پیدا ہوگیا۔

اس وقت سندھ میں تو مسلمان پہونچ ہی گئے تھے، لیکن اب ان کے حملے گندھارا کی طرف سے کابل پر بھی ہو چلے تھے، طبری کا بیان ہے کہ ۲۳ ہجری میں عاصم بن عمر قندہار (گندھارا) اور ہندوستان کی سرحد تک پہونچ گئے تھے اور حسب بیان بلاذری و یعقوبی خلافت منصور کے عہد میں ہشام بن عمر تغلبی کشمیر و ملتان فتح کرنے کے بعد قندھار پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے کشمیر کے جس حصّہ پر قبضہ کیا وہ وادیِ کشمیر سے تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ سندھ اور جھیلم کے درمیان جو حصۂ زمین تھا اس سے متعلق تھا۔ وادیِ کشمیر میں بدستور ہندوؤں کی حکومت قایم تھی اور صدیوں تک قایم رہی۔ ان راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور اونتی ورمن تھا (۸۵۵ء - ۸۸۳ء) جس نے اونتی پور بسایا۔ اس کے بیٹے کے زمانہ میں کشمیر اور شاہی حکومتوں کے درمیان پھر اتحاد قایم ہوگیا اور آیندہ برابر بڑھتا ہی رہا۔

۱۰۱۳ء میں محمود غزنوی نے گندھارا کی شاہی خاندان کی حکومت کو ختم کردیا، ہرچند اس خاندان کے آخری فرماں روا ترلوچن پال نے، کشمیری فوجوں کی مدد سے پورا مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ محمود غزنوی نے اس کے بعد کشمیر کا رخ کیا لیکن قلعۂ توہرا (یا بقول بیرونی لاہور) سے آگے نہ بڑھ سکا اور تاہم غزنوی عہد میں توہرا خاندان ہی کی حکومت کشمیر میں قایم رہی۔

راج ترنگینی کے بیان کے مطابق اس خاندان کا راجہ ہرش (۱۰۸۹ء - ۱۱۰۱ء) پاگل سا تھا اور اس پر مسلمانوں کا اثر بہت کافی تھا، چنانچہ اس نے ترکی سپاہیوں کو ملازم رکھا اور ہندو و بودھ مت کے بہت سے بتوں کو مسمار کرا دیا۔ اب یہاں ہندوؤں کی حکومت بہت ضعیف ہوگئی تھی، ہرطرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور آبادی اسلام قبول کرتی جارہی تھی۔

سب سے پہلا باقاعدہ حملہ مسلمانوں کا کشمیر پر ۱۳۰۰ء میں ہوا۔ یہ حملہ ایک تاتاری نسل کے سردار ذوالقدر خاں نے کیا تھا کہا جاتا ہے کہ جب کشمیر کو لوٹ کر یہ لوٹا تو اس کی ساری فوج برفباری کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ اس کے بعد شاہ میر سواتی (افغان) نے پوری طرح کشمیر پر تسلط قایم کرلیا اور "شمس الاعظم" کا لقب اختیار کرکے حکومت شروع کردی (۱۳۳۹ء)۔ حکومت کے اس تغیر کو وہاں کی آبادی نے بھی تسلیم کرلیا جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ شاہ میر نے ہندوؤں کے ساتھ بڑی رواداری کا سلوک کیا اور بڑے بڑے عہدوں پر کشمیری برہمنوں کو بدستور قایم رکھا۔ اس کے بعد سکندر شاہ کے عہد میں (۱۳۹۶ء - ۱۴۱۶ء) حالات بدلے۔ یہ سخت مذہبی قسم کا انسان تھا اور اس نے وہاں کے بہت سے مندروں کو مسمار کیا، لیکن زین العابدین کے عہد میں (۱۴۲۰ء - ۱۴۷۰ء) دوبارہ رواداری کا دور شروع ہوا اور اس نے اس قدر عدل و انصاف سے کام لیا کہ کشمیری اس کے عہد کو کشمیر کا عہدِ زریں کہتے ہیں۔ اس نے نہریں، سڑکیں اور پل بہ کثرت تعمیر کرائے اور ملک کو خوشحال بنانے میں ہر ممکن کوشش سے کام لیا۔ مگر افسوس ہے کہ اس کے جانشین سخت نااہل ثابت ہوئے اور آخرکار دردستان کے چک خاندان نے یہاں اپنا رسوخ اتنا قایم کرلیا کہ رفتہ رفتہ حکومت اسی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس خاندان کے افراد غازی خاں، حسین شاہ، محمد علی اور یوسف نے بادشاہ کا لقب اختیار کرکے سکّے بھی اپنے نام کے جاری کئے۔

اس کے بعد جب بابر نے شمالی ہند کو فتح کرلیا تو اس کی نگاہ کشمیر کی طرف بھی گئی، کیونکہ یہ خطۂ زمین اپنی شادابی اور سرد آب و ہوا کے لحاظ سے اس کے لئے بہت کشش رکھتا تھا، چنانچہ اس نے ایک مختصر سی فوج اس طرف روانہ کی لیکن وہ ناکام واپس آئی۔

جب ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالا تو اس کے عم زاد بھائی حیدر شاہ دُغلات نے جو کاشغر کا فرمانروا تھا ہمایوں کو متوجہ کیا کہ وہ کشمیر پر قبضہ کرکے اطمینان سے بیٹھ جائے۔ لیکن جب ہمایوں ایسا کرنے سے قاصر رہا تو خود

حیدر مرزا کشمیر پر حملہ کرکے ہمایوں کے نام سے وہاں حکومت کرنے لگا۔ اس کے بعد جب ۱۵۵۱ء میں وہ غالباً شاہانِ سور کی کوشش سے ہلاک کردیا گیا تو پھر چک خاندان کی حکومت بحال ہوگئی۔

اس کے بعد اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا اور ہرچند یعقوب خاں فرمانروائے کشمیر نے پوری طرح مقابلہ کیا لیکن اسے شکست ہوئی اور اس طرح ۱۵۸۶ء میں کشمیر سلطنتِ مغلیہ میں شامل ہوگیا۔

اکبر سب سے پہلے یہاں براہ درۂ پیر پنجال ۱۵۸۹ء میں پہونچا اور کچھ دن قیام کرکے واپس آیا۔ دوسرے سال پھر گیا۔ اس مرتبہ مشہور مورخ نظام الدین (مصنف طبقات اکبری) بھی اس کے ہمرکاب تھا۔ تیسری مرتبہ گیا تو اس کا وزیر ٹوڈرمل بھی ساتھ تھا، اسی زمانہ میں یہاں کا بندوبست ہوا اور سری نگر کی ایک پہاڑی کو قلعہ بند کرکے اس کا نام ہری پربت رکھا گیا ——

ابوالفضل نے اکبر کے زمانہ میں کشمیر کے حالات آئین اکبری میں بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

اکبر کے ساتھ جہانگیر بھی کشمیر گیا تھا اور اسے یہ مقام بہت پسند آیا چنانچہ جب وہ فرمانروا ہوا، تو اس نے یہاں متعدد باغ اور محل طیار کرائے جن میں نشاط باغ، اچھابل اور ویرناگ بہت مشہور ہیں۔ جہانگیر نے اپنی محبوب بیوی نورجہاں کا ذوق پورا کرنے کے لئے چنار کے پودھے بھی ایران سے منگوا کر بہ کثرت یہاں نصب کرائے، جن سے کشمیر کے حسن و دلکشی میں واقعی بہت اضافہ ہوگیا۔

شاہجہاں نے بھی یہاں متعدد باغ نصب کرائے اور علی مرداں خاں یہاں کے گورنر نے اسی زمانہ میں پیرپنجال روڈ پر متعدد سرائیں تعمیر کرائیں۔ داراشکوہ نے ایک قصر پری محل کے نام سے تعمیر کرایا جس کے کھنڈر، ڈل کے کنارے اب بھی نظر آتے ہیں۔

اورنگ زیب یہاں اپنے عہد میں صرف ایک بار آیا اور چند مسجدیں تعمیر کرا گیا جو اسوقت بھی موجود ہیں۔ برنیر اورنگ زیب کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس نے اس عہد کے مفصل حالات قلمبند کئے ہیں۔

نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اور مغلیہ حکومت ضعیف ہوگئی تو کشمیر کے صوبہ دار تقریباً خود مختار ہوگئے۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی قابض ہوگیا اور ۱۷۵۶ء میں اس نے بلند خاں سدوزئی کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا، درانیوں کے زمانہ میں کشمیر کی حالت بہت خراب ہوگئی اور اندرونِ ملک میں کئی دعویدارِ حکومت پیدا ہوگئے، خصوصیت کے ساتھ محمود شاہ اور شجاع الملک کے مابین یہ کشمکش عرصہ تک قایم رہی اور دونوں نے اپنے اپنے نام کے سکے جاری کئے۔ آخرکار فتح خاں بارک زئی رنجیت سنگھ فرمانروائے پنجاب کی مدد سے کشمیر پر قابض ہوگیا (۱۸۱۳ء)۔ گو اس کے بعد بھی یہاں کے فرمانروا محمود شاہ اور ایوب شاہ رہے لیکن یہ فرمانروائی برائے نام تھی اور اصل اقتدار بارک زئی سرداروں کو حاصل تھا، یہاں تک کہ محمد اعظم شاہ بارک زئی نے محمد کے نام سے اپنا سکہ بھی جاری کردیا۔ اس زمانہ کی آپا دھاپی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سرداروں کے علاوہ ایک مقامی درویش نورالدین نے بھی اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔

آخرکار ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کرکے اسے اپنے قلمرو میں شامل کرلیا اور یہ اختلاف ختم ہوگیا۔ سکھوں کا دورِ حکومت گو سختی و جبر کا دور تھا اور مورکرافٹ سیاح نے سکھ شاہی دور کے جو حالات کشمیر کے متعلق لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں کی رعایا کس قدر پریشان تھی۔

اسی زمانہ میں جموں کے ڈوگرا خاندان میں تین بھائی دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سوچیت سنگھ ابھرے۔ یہ سکھ نہ تھے ہندو تھے اور ماوراء وادیِ کشمیر کے پہاڑی علاقہ کی راجپوت نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ دھیان سنگھ کو سکھ حکومت میں ایک با اقتدار جگہ مل گئی، اور رنجیت سنگھ نے جموں کی گدی پر گلاب سنگھ کو بٹھا دیا (۱۸۲۰ء) اس نے رنجیت سنگھ کے نام پر متعدد پہاڑی ریاستوں او

کشت دار و لداخ کو سکھ حکومت میں شامل کرلیا جس سے اس کا درخور سکھ دربار میں بہت بڑھ گیا۔ رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد جو اختلال سکھ حکومت میں پیدا ہوا اس سے دھیان سنگھ نے فائدہ اٹھاکر کچھ عرصہ کے لئے کشمیر پر بڑا اثر و اقتدار پیدا کرلیا اور گلاب سنگھ نے اس کی مدد سے جموں کے پہاڑی علاقوں میں اپنی پوزیشن بڑی مضبوط کرلی۔

اس کے بعد جب ۱۸۴۴ء میں سندانوالیا نے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کو قتل کردیا تو گلاب سنگھ کچھ عرصہ کے لئے کشمیر سے ہٹ کر اپنی پہاڑی حکومت میں چلاگیا۔ اس وقت کشمیر میں سکھ حکومت حد درجہ متزلزل حالت میں تھی کہ بومبا قوم نے سکھوں کی فوج سے بھی مقابلہ شروع کردیا۔

اس کے بعد جب ۱۸۴۵ء میں خالصہ فوج اور انگریزی سپاہ کے درمیان لڑائی ہوئی تو گلاب سنگھ نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا اور جنگ کے اختتام کے بعد شرایط صلح کی گفتگو شروع ہوئی تو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے اس کو اپنا نمایندہ منتخب کیا۔ آخرکار میجر لارنس کی تجویز کے مطابق انگریزی حکومت نے کشمیر کو پنجاب سے جدا کرکے ایک علحدہ ریاست قرار دیا اور گلاب سنگھ کو وہاں کا راجہ تسلیم کرلیا گیا۔ گلاب سنگھ اور انگریزی حکومت کے درمیان ۱۸۴۶ء میں جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے گلاب سنگھ نے برطانوی اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے ایک بڑی رقم خراج یا قیمت کی صورت میں بھی ادا کی، لیکن اس کے بعد بھی گلاب سنگھ کا قبضہ کشمیر پر آسانی سے نہ ہوسکا کیونکہ یہاں گورنر امام الدین جو بومبا قوم سے مل گیا تھا، اس نے گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست دی اور اپنا اثر کشمیر میں قایم کرلیا۔ آخرکار برطانوی فوج نے بومبا قوم کی بغاوت فرو کرکے جموں اور کشمیر پر گلاب سنگھ کا پورا تسلط قایم کردیا اور حکومت ڈوگرا خاندان میں منتقل ہوگئی۔

جفر و رمل کی نایاب کتابیں

۱- (عربی) مصباح الرموز .... منقول از امام جعفر صادق ..... عہ

۲- (عربی) علم جفر ....

(عربی) قرعہ شریفیہ .... منقول از محی الدین العربی ....

(فارسی) علم جفر ....

(عربی) کشف الساطع (جفر) ....

(فارسی) مقصد اقصیٰ (جفر) ....

(عربی) کتاب زایرجات و اشرف المربعات۔ از امام غزالی

(ایک جلد) ..... سے

۳- (اردو) کوکب الرمل .... عہ

(اردو) محبوب الرمل .... صہ

۴- (فارسی) مصداق الرمل .... از محمد عطا لاہوری .... صہ

(فارسی) انوار الرمل .... از حاجی عبدالغنی شروانی .... عـــہ

۵- (فارسی) سراج الرمل .... عہ

(فارسی) مجموعہ رسائل رمل .... سے

۶- (فارسی) خواب نامہ یعنی کامل التعبیر۔ مطبوعہ بمبئی ۱۲۸۵ھ۔ صفحہ ۳۱۰ ..... صہ

منیجر نگار لکھنؤ

چند لمحے داغ کے ساتھ

اُردو شاعری میں جتنی خطرناک شخصیت داغ کی ہے شاید ہی کسی اور کی ہو۔ ان کی غزلوں سے لطف اُٹھانے کے لئے ایک خاص قسم کے "بلوغ" کی ضرورت ہے۔ عمر ہی کا نہیں مزاج اور ذہن کا بھی "نابالغ" ذہنوں کو یہ شاعری یا تو تباہ کر کے ایسی راہوں پر ڈال دے گی جہاں وہ کہیں کے نہ رہیں گے یا وہ لوگ جو چند اخلاقی اقدار کے سائے میں پروان چڑھے ہیں وہ پڑھکر کچھ جھینپ سے جائیں گے اور بگڑکر کہیں گے لاحول ولاقوۃ یہ کیا بکواس ہے۔ یہ تو عیاشی اور ہوس کاری کا کھلم کھلا پروپگنڈا ہے۔ قوم کی تباہی اور نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑنے کا پورا سامان۔

ہمارے ملک میں ذہنی بلوغ کی بہت کمی ہے اور اسی لئے نقادوں کو یہاں بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے جو لوگ عام ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہوکر لکھتے ہیں ان کے لئے تو خیر کچھ نہیں لیکن جہاں آپ نے صحیح معنی میں کوئی سوجھ بوجھ دکھائی تو بس سمجھ لیجئے کہ "بلو" بنے۔ عام بھیڑ چال نے تو ہمارے ادب میں عجیب عجیب کرشمے دکھلائے ہیں۔ میر نے اپنی شاعری میں اپنے غموں کو نمایاں کیا تو "مشاعرے باز شاعروں" کو ایک نسخہ ہاتھ لگا کہ "غم" ہی شاعری کا موضوع ہے۔ اب جس کو دیکھئے روتا بسورتا نظر آئے گا چاہے اس کی زندگی میں دور دور بھی کہیں غم کا نشان نہ ہو۔ معمولی شاعروں کو تو چھوڑئے لکھنؤ اسکول کے بہت بڑے استاد شیخ امام بخش ناسخ تک نے ایک بار صرف اس لئے فاقہ کشی اور چلہ کشی شروع کی کہ ان کے شعروں میں درد پیدا ہو جائے اور جب اس کے باوجود بھی درد نہ پیدا ہوسکا تو لوگوں نے سمجھایا کہ بھائی آپ کس جھنجھٹ میں پڑے ہیں اس چوڑے چکلے سینے کیلئے چودہ سیر خوراک اور ۹۰، ۱۲ ڈنڑ ہی ٹھیک ہیں اور شاعری کے لئے بھی وہی کرتب اور پہلوانی آپ کے لئے موزوں ہے۔ ناسخ آدمی سمجھدار تھے۔ سمجھ گئے اور پھر اسی رنگ کو بنایا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔

میرا خیال ہے کہ کسی شاعر کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ مزاج کو سمجھ لے اور اپنی شاعری کو اسی راستہ پر لگائے جس سے اس کے مزاج کو مناسبت ہو، شاعری اگر صحیح معنوں میں شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار کا آئینہ بن جائے تو ہر شاعر کامیاب ہوسکتا ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ اُٹھاکر دیکھ لیجئے، جن لوگوں نے اپنے مزاج کے مطابق شاعری کی انھیں کلاسکس میں جگہ دی گئی، جن لوگوں نے بازار میں چلتی ہوئی کسی چیز کو دیکھ کر اسی سُر میں سُر ملانا شروع کردیا وہ اپنی گرہ کا مال بھی کھو بیٹھے۔ غالب یا اقبال کی تقلید کرنے والوں کا انجام کس نے نہیں دیکھا۔

داغ کے متعلق میری سب سے پہلی رائے یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج کو پالیا تھا۔ اس معاملہ میں جتنی کامیابی ان کو ہوئی ہے بہت کم اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اچھے اچھے لوگوں کو اپنی راہ پر لگنے سے پہلے اِدھر اُدھر بھٹکنا پڑا ہے۔ بعضوں نے بڑا شاعر بننے کی دھن میں اور استادی کے مرتبے تک پہونچنے کے خبط میں اپنی شخصیت کو بالکل فراموش کردیا اور کسی پچھلے شاعر کی تقلید میں اپنا کافی وقت خراب کیا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنھیں ان کے استادوں نے نقصان پہونچایا اور اپنی ڈگر پر خواہ مخواہ چلانے کی کوشش کی۔ لیکن داغ کو دیکھئے کہ ایسے وقت میں آنکھ کھولتے ہیں جب ایک طرف میر کی عظمت لوگوں پر اتنی چھائی ہوئی تھی کہ

ناسخ جیسے آدمی کو ماننا پڑا تھا کہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" دوسری طرف خود ناسخ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شاہ نصیر اور ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا کیا ذکر مومن اور غالب جیسے خود دار و خود کام شاعر بھی ایک وقت میں ناسخ کی تقلید پر فخر کرتے تھے بعد میں غالب نے اور ایک حد تک مومن نے بھی اپنے آپ کو سنبھالا لیکن شاہ نصیر اور ذوق کی بے جان شاعری میں اس "ناسخیت" کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ داغ کے سامنے میر کا کلام تھا، ناسخ کی شاعری تھی اور ان کے رنگ میں شاہ نصیر اور ذوق تھے جو کم از کم اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر تھے اور ہاں انھیں کے سامنے غالب نے بھی اپنی فکری شاعری کے جوہروں کو چمکا لیا تھا اگرچہ اسے عام مقبولیت نہیں ملی تھی تاہم ذہین آدمی کے لئے وہ بھی ایک لالچ دلانے والی چیز تھی۔ لیکن داغ کی ہوشیاری دیکھیے کہ صرف اپنے استاد ذوق سے زبان کی صفائی اور سادگی لے کر ایک علحدہ راہ پر چل دیا۔ اس راہ پر جن لوگوں نے اپنے پاؤں کے نشانات بہت گہرے چھوڑے ہیں ان میں جرأت کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ داغ کا رشتہ جرأت سے جوڑتے ہیں یا داغ کو بھی جرأت ہی کے قبیلے کا ایک شاعر سمجھتے ہیں۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں، بات یہ ہے کہ لوگ شاعر کے مزاج کا اندازہ اس کی شاعری کے موضوعات سے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے۔ ایک ہی موضوع پر دو طرح کی شخصیتیں دو علحدہ لب و لہجہ اختیار کریں گی اور ان کے اظہار میں نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ "لب و لہجے" کی شاعری میں اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ اسی سے پتہ چل سکتا ہے کہ شاعری میں کتنا حصہ فطری ہے اور کتنا غیر فطری جو لوگ میر کے دیوان سے ان اشعار کی ایک فہرست بناتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طور امرد پرستی کا ذکر ہے یا "دلی کے کج کلاہوں" میں سے کسی کا نام آگیا ہے اور اس بنا پر اسے میر کی شخصیت سے منسوب کرتے ہیں وہ لوگ اسی دھوکے میں مبتلا ہیں کہ چونکہ یہ موضوع شاعر کے یہاں کسی نہ کسی طرح بندھا ہے اس لئے اس کا تعلق بھی شاعر کی سوانح عمری کے کسی نہ کسی باب سے ضرور ہوگا۔ یہاں میں اپنا تاثر بتا دوں کہ میں نے میر کے دیوان میں میر کا کوئی اچھا شعر اور ان کے مخصوص لب و لہجے کا کوئی شعر ایسا نہیں پایا جس کا تعلق امرد پرستی سے دور کا بھی ہو۔ آپ غور سے پڑھیں تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ جو درد مندی، سوگواری، ایک خاص طرح کی بے نیازی اور قلندری، نرمی اور مانوسیت کا انداز میر کے اچھے شعروں میں نہیں ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے میر ہی پر کیا موقوف ہے آپ کہیں تو میں جرأت کے یہاں غالب کے رنگ کا شعر نکال کر دکھا دوں اور ناسخ کے یہاں اقبال کے رنگ کا۔ اپنے رنگ سے ہٹ کر انھوں نے کبھی کبھی کسی موضوع کو باندھ دیا ہے اس کی بنا پر اس کے مزاج کو متعین کرنا شاعر کے ساتھ تو ظلم کرنا ہی نہیں ادب میں گمراہی بھی پھیلانا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے داغ اور جرأت میں مماثلت ہے۔ یعنی دونوں کا موضوع "معاملہ بندی" ہے لیکن داغ کا کارنامہ معاملہ بندی سے آگے ہے۔ میرا خیال ہے کہ داغ کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی شاعری کا نشاطیہ لب و لہجہ ہے۔ جرأت کی شاعری میں بھی محبت کے بجائے ہوس پرستی ہے اور داغ کے یہاں بھی لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت کے یہاں صرف ذہنی عیاشی ہے جسے ایک بیماری کہیے۔ جنسی دباؤ اور جنسی معاملات میں محرومی اور ناکامی بعض اوقات لوگوں کو ننگی تصویریں دیکھ کر، فحش باتیں کہہ کر جنسی معاملات کا ذکر کرکے یا جسم اور جنسی اعضا کا نام لیکر جو لذت ملتی ہے اسے آجکل کی نفسیات میں Perversion کہتے ہیں۔ جرأت کی شاعری اسی "پرورژن" کا نتیجہ ہے۔ جرأت عیاشی کر نہیں سکتے عیاشی کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ محبوب کو پاتے نہیں بلکہ خیال میں اسے پاکر اس کے وصال کا ذکر کرتے ہیں اور اس ذکر سے انھیں ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ غالباً ریختی کی ایجاد بھی اسی جذبے کی عکاسی کی ایک شکل ہے۔ لیکن داغ کی شاعری ہوس کی شاعری ہوتے ہوئے بھی صحت مند شاعری ہے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد اصلیت پر ہے۔ یہ ہوس انگیزی تندرست قسم کی ہوس انگیزی ہے، یہ کسی منفی رجحان کی نمایندگی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک عیاش آدمی کی آزادیوں اور اس کی فتوحات کا بیان ہے۔ داغ کی شاعری کا عاشق جنسی تشنگی کا شکار نہیں ہے بلکہ بہت

آسودہ ہے ۔ وہ آئے دن وصال کے مزے لوٹتا ہے ۔ اس کی محبوب سے چھیڑ چھاڑ واقعی چلتی ہے اس کے محبوب کے یہاں رقیبوں کا جمگھٹ خیالی نہیں بلکہ اصلی ہے ۔

ممکن ہے بعض لوگ اس بات پر حیرت کا اظہار کریں کہ جب ہندوستان زوال کے دور سے گزر رہا تھا اور سارے شاعروں کے یہاں اس زوال کی وجہ سے قنوطیت اور بے دلی ملتی ہے تو داغ کے یہاں کیوں اس کے خلاف نشاط کے عناصر ملتے ہیں اور اگر یہی نشاط کے عناصر ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اور ان کا مزاج ہیں تو یہ بڑی غیر فطری سی بات ہے ۔ بات یہ ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کی طنابیں اکھڑنے کے بعد بھی ہمارے یہاں جاگیر دارانہ ماحول باقی تھا ۔ خاص شاہی خاندان کے افراد یا خود بہادر شاہ معتوب ہوئے جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا لیکن غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے حکومت تو قایم کر لی البتہ بر بنائے مصلحت انھوں نے جاگیر دارانہ ماحول کو قایم رکھا اور لوگوں کو جگہ جگہ جاگیر داریاں، پنشنیں اور معافیاں دیدی گئیں جس کے نتیجے میں رئیسوں اور نوابوں کا طبقہ اب اور بھی بڑھ گیا ۔ پہلے تو صرف امراء یا دربار شاہی سے وابستہ لوگ ہی دادِ عیش دے سکتے تھے لیکن اس ماحول میں ایک کھاتا پیتا رئیس بھی اپنے دل کے ارمان پورے کر سکتا تھا ۔ داغ خود ایک نواب خاندان کے چشم و چراغ تھے پھر رامپور اور حیدر آباد میں ان کی عیش و عشرت کی زندگی ۔ ان چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ داغ کو ان سنگین حقیقتوں تک جانے کی نوبت ہی نہ آئی جہاں جانے کے بعد ایک طرف تو انسان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اپنے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی سوچنے لگتا ہے دوسرے یہ کہ شاعری میں فکر اور سنجیدگی کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں ۔ داغ کو جو ماحول ملا وہ ان کے اسی مزاج کے مطابق تھا جیسی کہ ابتدا میں ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی ، بعد میں کامیابیوں نے ان کے قدم چومے تو پھر انھیں کسی اور حقیقت سے ٹکر لینے کا مرحلہ ہی نہیں پیش آیا ۔ ان کی شاعری کا نشاطیہ رجحان سو فیصدی فطری اور اصلی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس رنگ میں بھی انھیں لوگوں کو کامیابی نصیب ہوئی جو اس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اقبال نے دو ایک غزلیں لکھنے کے بعد ہی کیوں داغ سے علٰحدگی اختیار کر لی اس کی وجہ مزاج اور ماحول کا اختلاف ہی تھا داغ کے رنگ کی مقبولیت کو دیکھ کر امیر مینائی نے ان کے رنگ میں شعر کہنا شروع کیا ۔ ان کی استادی مسلم لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ امیر مینائی گھاٹے میں رہے کیونکہ یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا ۔ وہ بیچارے پرہیز گار قسم کے آدمی تھے وہ چھیلا پن کہاں سے لا سکتے جو صرف بوالہوسی کے راستے پر چل کر ہی مل سکتا ہے ۔ البتہ داغ کے رنگ میں سب سے زیادہ کامیابی ریاض خیر آبادی کو ہوئی ۔

ریاض کے متعلق میں اس سلسلہ میں اپنے دل کا ایک چور بیان کر دوں ۔ ریاض میرے پسندیدہ شاعروں میں ہیں اور جتنے اشعار ان کے مجھے یاد رہتے ہیں بہت کم شاعروں کے یاد رہتے ہیں لیکن ریاض کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت جو بتائی جاتی ہے یعنی "خمریات" یہ بات میرے گلے سے نہیں اترتی ۔ بعض لوگ اس بات کو بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ دیکھئے ریاض نے کبھی شراب کو منہ سے بھی نہیں لگایا لیکن شراب میں اتنے شعر کہے ہیں ۔ ان کی خدمت میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا تاثر اس معاملہ میں بالکل علٰحدہ ہے ۔ ریاض کی خمریاتی شاعری میں وہ کیفیت نہیں ملتی جو واقعی شراب پینے کے بعد پیدا ہوتی ہے یا ان شاعروں کے یہاں مل سکتی ہے جو شراب پیتے تھے ۔ در اصل داغ کی طرح ریاض کا مزاج بھی خالص عیاشانہ ہے اور ان کے یہاں بھی وہی نشاط، شوخی، چھیڑ چھاڑ، معاملہ بندی اور ہوس پرستی ملتی ہے جو داغ کا خاصہ ہے اور یہ چیز غیر فطری نہیں ہے کیونکہ داغ کی شراب نوشی سے تو انکار کیا جا سکتا ہے ان کی کوچہ گردی سے انکار ذرا مشکل ہے اور ان کے سوانح نگار ان کی فتوحات کو چھپانا چاہیں بھی تو نہیں چھپا سکتے ، ریاض کے مزاج کی یہی رنگینی اور عیاشی اور ان کا یہی نشاط ان کی شاعری کی خصوصیت ہے ۔ چنانچہ ریاض کے بہترین اشعار وہی ہیں جہاں حسینوں سے ، واعظ سے ، محتسب و ناصح سے چھیڑ چھاڑ رہتی ہے ۔

اور وہ اپنی فتحمندیوں کا ذکر کر کے خوش ہوتے ہیں ۔

ہم مل گئے ، ہم پا گئے ، ہم لے گئے اُن کو — وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر
میں ڈراتا ہوں یہ کہہ کہہ کے حسینوں کو ریاض — جو نہ پورا ہو مرے دل میں وہ ارمان نہیں

بہر حال اس سلسلہ میں عرصہ سے سوچ سمجھ کر میں نے یہ رائے قایم کی ہے اور اس پر مجھے اصرار ہے کہ ریاض خمریات کے شاعر نہیں ہیں بلکہ نشاط اور شوخی کے شاعر ہیں، معاملہ بندی اور ہوس پسندی کے (حسرت کی زبان میں فاسقانہ) شاعر ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے پیش رو داغ ہی نہیں امیر مینائی کا شاگرد ان کے حریف داغ کے رنگ کو اپنا کر اپنے جوہر کو چمکاتا ہے یہ بھی شاعرانہ مزاج ہی کے کرشمے ہیں۔ ایک امیر مینائی ہی کیا غالب کے شاگردوں تک نے غالب کو چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کیا اور میرا خیال ہے ٹھیک ہی کیا۔ فراق نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ حالی جیسے ثقہ آدمی بھی داغ کے رنگ پر بری طرح للچائے ہیں اور محمد حسن عسکری نے ابھی حال ہی میں نقوش لاہور میں حالی کی غزل گوئی پر ایک مضمون لکھ کر ان کے "بھلے مانس" ہونے کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اس کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حالی کی شخصیت میں داغ والا عنصر بھی تھا لیکن دوسری طرف وہ بعض اسباب کی بنا پر ایک خاص قسم کی "سعادت مندی" کا بھی شکار تھے جو غالباً ان کو اپنے ماحول اور تربیت کے نتیجے میں ملی ہوگی اور اسی لئے عمر بھر ان کی شخصیت کے دونوں عناصر میں کشمکش جاری رہی۔ ان کی شاعری میں ایک دبا دبا سا انداز، ایک ڈھیلا پن اور طاقت وخود اعتمادی کی کمی ملتی ہے اس کی وجہ غالباً یہی ہے۔

داغ کی شاعری کسی بھی ماحول کی پروردہ ہو۔ وہ جاگیر دارانہ نظام کی دین سہی۔ اس میں نوابوں کی عیاشیاں اور طوائفوں سے محبت کا ذکر سہی لیکن اس میں بھی ہمارے لئے بہت سے عناصر قابلِ قدر ہیں۔ محراب ومنبر والوں کو تو چھوڑئے عام نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ بات ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ جبکہ عام طور پر ہمارے سماج میں لوگوں کے اندر ایک خاص قسم کی "منافقت" ملتی ہے یعنی جب وہ ہوسکاریوں میں مبتلا ہوں گے تب بھی زبان پر تسبیح ومصلّے کا ذکر ہوگا۔ ہمارے نوجوان بزرگوں سے چھپ کر سارے کام کریں گے، جنسی مسائل پر گفتگو ہوگی، فحش باتیں ہوں گی، عریاں ناول پڑھے جائیں گے لیکن پھر وہ اپنے اوپر ایک خول چڑھالیں گے۔ اس خول کو چڑھانے اور اندر اندر گھٹنے سے شخصیتوں میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ داغ نے گویا اس سماج میں اس خول کو اُتارا ہے جب آج کی نسبت اخلاقی پابندیاں کہیں زیادہ تھیں۔ اس زمانہ میں عام شاعروں کا یہ حال تھا، شراب پیتے تھے اور طوائفوں سے عشق کرتے تھے لیکن شعر تصوف کے کہتے تھے۔ یا یہ کہ نماز پڑھتے ہیں اور تصوف ومعرفت میں زندگی گزر رہی ہے لیکن عشق ومحبت کے شعر اس لئے کہہ رہے ہیں کہ شاعری کی یہی روایت ہے۔ داغ نے اس تضاد کو ختم کر کے شاعری میں بیباکی اور جرأت کا میلان پیدا کیا۔ داغ کے یہاں گھناؤنے یا اخلاق وشائستگی سے گرے ہوئے اشعار نہ ملیں گے جس پر خوا مخواہ کوئی کفر کا فتویٰ صادر کردے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ گھناؤنی باتوں کو اور پھوہڑ قسم کے موضوعات کو بھی داغ نے اپنے کمال شاعری سے حسین اور آبدار بنا دیا ہے اور ایسا کہ رند تو رند زاہدِ خشک کے مُنھ سے بھی بے ساختہ واہ نکل جائے۔ داغ کے طرزِ بیان میں جو صفائی اور وضاحت، جو چستی، جو نکھار، جو البیلا پن، جو فنی رچاؤ ملتا ہے وہ بہت کم غزل گویوں کے حصے میں آیا ہے۔ داغ کی غزل میں غزل گوئی اپنے پورے شباب پر پہونچ جاتی ہے۔ جن مسایل پر دوسرے شاعروں کی زبانیں بند سی ہوجاتی ہیں وہاں داغ ایسے بے ساختہ انداز سے گزر جاتے ہیں کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔ داغ کا فن ان کی شخصیت ہی کی ایک تصویر ہے اس لئے اس میں بڑی جان ہے۔ ان کے مزاج کے نشاطیہ عناصر ہی نے اس طرزِ بیان اور لب ولہجہ کو بھی جنم دیا ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے صرف زبان کے بل بوتے پر داغ کا رنگ اپنانا چاہا ان کی مٹی بڑی خراب ہوئی۔ ان کی شاعری میں کسی کیفیت کے بجائے "دو دو چار" والی بات پیدا ہوگئی۔ البتہ ان شاعروں نے داغ سے بڑا فایدہ اُٹھایا جو پہلے ہی تھے اس رنگ کی شاعری

کے لئے اور ان لوگوں ہی کے کلام کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ اور داغ اسکول نے اُردو غزل کی راہ سے وہ سارے روڑے صاف کردئے جس کی وجہ سے اس میں ایک رکاؤ اور بند بند سی کیفیت تھی۔ اب اس راستے میں بڑی صفائی، چمک اور اُجالا ہے۔ حسرت موہانی سے لیکر فراق گورکھپوری اور عدم تک نے اس اُجالے کی مدد سے اپنی منزلیں تلاش کی ہیں۔

مجھے جو باتیں کہنی تھیں کہہ چکا۔ اب آپ کو داغ کے کچھ اشعار سنانا چاہتا ہوں:۔

زلف برہم، عرق آلودہ جبیں، دامن چاک
کس کی آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا

رکھ دیا ہاتھ مرے منہ پہ بتِ کافر نے
صبح اُٹھتے نہ دیا نام خدا کا لے کر

شبِ وصل ایسی کھِلی چاندنی
وہ گھبرا کے بولے سحر ہوگئی

وہ روزِ حشر ہے، تنہا نہیں کہ راہ ملے
کہاں چھپوگے جو دو چار داد خواہ ملے

بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ،
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلف عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

کھل کھیلئے، کھل جائیے، دل کھول کے ملئے
کب تک گرہِ بندِ قبا کو کوئی دیکھے،

میرے گھر خوف سے تھم تھم کے قدم رکھتے ہو
کیا ہوا اب وہ کہاں شوخیِ رفتار گئی

حلقۂ آغوش ہے، یہ حلقۂ گیسو نہیں
کسمسا کر ہو نہ جائے گی رہائی آپ کی

سبب کھلا یہ ہمیں ان کے منہ چھپانے کا
اُڑا نہ لے کوئی انداز مسکرانے کا

ملے شباب میں ہر ایک گلعذار سے ہم
کٹے بہار کے موسم میں کس بہار سے ہم

خمار آلودہ آنکھیں، بل جبیں پر، درد ہی سر میں
رہے تم رات بھر بے چین کس کمبخت کے گھر میں

ٹوک کر رستے میں پیار آہی گیا اس شوخ پر
وہ نظر حیرت زدہ، وہ آنکھ شرمائی ہوئی

گالیاں غیر کو دیتا ہوں سنو تم خاموش
میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے،
سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے

چارہ گر بھی ہم نشیں تھا رات کو ناصح بھی تھا
ورنہ بے تابی میں ہم کیا جانے کیا کر بیٹھتے

جب سے یہ سنا داغ نے کی عشق سے توبہ
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں کیا دل کو لگی ہے

پارسا جان کے وہ مجھ سے ملے دھوکے میں
آگئی کام مری پاک نگاہی کیسی،

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے صبا
چھپا رہے ہیں وہ سینہ مگر نہیں چھپتی

اِدھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں
مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے،

دل کا کیا حال کہوں صبح کو جب اس بت نے
لیکے انگڑائی کہا ناز سے ہم جاتے ہیں،

خلیل الرحمان اعظمی ایم۔اے

فلاسفۂ قدیم — اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔ ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ ۲۔ مادئین کا مذہب۔ نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ — منیجر نگار لکھنؤ

مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء

پاکستان کے علماء میں آج کل قیادت کی جو ہوس پائی جاتی ہے اُس کے پیشِ نظر اسی قسم کی ایک تحریک کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر لکھنؤ میں شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک کے روحِ رواں مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اس مضمون میں شبلی کے اپنے بیانات کی روشنی میں اس تحریک کے مقاصد کا تجزیہ کیا گیا ہو چونکہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے یہ تجزیہ نہایت مختصر ہے۔

ندوہ کی بنیاد، جیسا کہ معلوم ہے، مولانا شبلی کی شرکت سے پہلے پڑ چکی تھی۔ اُنھوں نے کانپور میں اس کے اجلاس میں شرکت کی اور ۱۹۰۵ء سے اس میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی اور عربی تعلیم میں اچھی خاصی کشمکش تھی۔ مولویوں کو اپنی اقتصادی بدحالی کا احساس ہو چلا تھا اور ان کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ تعلیم کے بعد روٹی کہاں سے ملے گی۔ اس غرض کے لئے حکومت کے ادارے ناکافی تھے۔ پھر شبلی کی اپنی ہنگامہ پرور طبیعت کے لئے ایک میدانِ عمل درکار تھا۔ آدمی ذہین اور ساتھ ہی ساتھ جری اور دلیر بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے علماء کو للکارا اور بتایا کہ انگریزی پڑھنے والوں کا تعصب عربی کے خلاف ناروا ہے۔ سرسید کا یہ منشا نہ تھا کہ عربی تعلیم ختم کر دی جائے اور اگر بالفرض ایسا تھا بھی تو عربی کی اہمیت بہر حال مسلم تھی۔ مگر علماء کے لئے جدید علوم کا جاننا ضروری تھا۔ ان کا ایک ضروری فرض یہ بھی تھا کہ وہ یورپی مصنفوں کے حملوں سے اسلام کو بچائیں۔ نئے حالات سے اپنے آپ کو کسی حد تک مطابق کریں اور یورپ کی خوبیوں سے سبق حاصل کریں۔ عربی کے مروج نصاب میں ترمیم کی جائے اس کی مدت میں تخفیف ہو۔ فنون کی تعداد کم کر کے ان کے خصوصی مطالعے پر توجہ کی جائے۔ انگریزی زبان لازمی ہو اور تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کی بھی مشق بہم پہونچائی جائے۔ طلباء کو سیاست میں حصہ لینے سے باز رکھا جائے مگر اُنھیں ملک کے سیاسی حالات سے باخبر رکھا جائے۔ ان سب باتوں کے علاوہ جو ندوہ میں شبلی کی بدولت ظہور میں آئیں، شبلی نے اپنا ذاتی کتب خانہ ندوہ کو عطا کیا عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ مصر و عرب کے مجلے اجراء ہوئے اور عام طور پر علماء میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ جوش جسے شبلی علی گڑھ میں برانگیختہ نہ کر سکے تھے اُسے اُنھوں نے ندوہ میں برانگیختہ کیا۔[1]

مولانا شبلی کا ایک مقصد ندوہ کے ذریعے ایسے علماء پیدا کرنا تھا جو جدید تعلیم یافتہ گروہ کی تشفی کر سکیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مولوی جدید علوم میں اُن لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جنھوں نے کالجوں اور اسکولوں میں ان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ غریب ان کی تشفی کیونکر کر سکتے تھے۔ پھر جو لوگ درحقیقت اسلام پر ایک بہتر نظامِ زندگی کی حیثیت سے ایمان رکھتے تھے وہ مولویوں کی تشفی کے بغیر بھی اس کے قائل تھے۔ اسی طرح جو لوگ مذہب سے بالعموم یا اسلام سے بالخصوص مطمئن نہیں تھے وہ مولویوں کے باوجود مذہب پر نکتہ چینی سے باز نہیں آسکتے تھے۔ بات اصل میں وہی ہے کہ مولانا شبلی نئے زمانہ میں مولویوں کے وجود کے لئے ایک وجہ جواز ڈھونڈنا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیاتِ شبلی" یا "شبلی نامہ" اور "موجِ کوثر" از شیخ محمد اکرام

تھے ۔ اسلام کا مسئلہ مولویوں کے لئے اتنا اہم نہیں تھا جتنا پیٹ کا سوال ۔ ۱۸۹۴ء کے اجلاس ندوہ میں مولانا شبلی علماء کے ان "وسیع اختیارات" کا ذکر کرتے ہیں جو انھیں قوم پر حاصل ہوسکتے ہیں ۔ جب علماء ایک مجموعی قوت پیدا کرلیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

"۱ ۔ اس وقت ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اوقاف کے لاکھوں روپے جو متولیوں کے ہاتھوں نہایت بیدردی سے برباد ہو رہے ہیں ندوہ کے ہاتھ میں دیدئے جائیں اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے گی ۔

۲ ۔ ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم جو اس وقت ابتری کی حالت میں ہے اسکی اصلاح کو دیجائے اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ پر بہت کچھ لحاظ ہوگا ۔

۳ ۔ ندوہ دعوے کرسکتا ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں عدالت صدر میں فقہی مسایل کے لئے قاضی و مفتی مقرر کئے جاتے تھے وہ قاعدہ سرنو سے قایم کیا جائے ۔

۴ ۔ ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعت اسلام اس کی ہدایتوں کی پابند ہو ۔ اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے ۔ اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کرسکے"[1]

ان چاروں تجویزوں میں پہلی ، دوسری اور تیسری تجویزیں دراصل مولویوں کے واسطے حکومت کے اندر اثر و رسوخ بڑھانے کے ذرائع ہیں ۔ شبلی نے مولویوں کو مسلمانوں کا روحانی پیشوا ہی نہیں ، دینوی امام بھی بنانا چاہا ۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ یہ تجاویز ناکام ہوئیں ۔ اس سوال کے جواب میں کہ مولوی کھائیں گے کیا ؟ شبلی لکھتے ہیں :-

"اس سوال کا جواب آسان تو یہ تھا کہ اب تک عام مولوی کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور علم الاعداد سے نظر آتا ہے کہ عربی مدارس کی تعداد گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے ۔ جب جب ہم اس کو روک نہیں سکتے تو اس میں کیا ہرج ہے کہ اس گروہ کو زیادہ بکار آمد بنایا جائے"[2]

کسی گروہ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہا ہے اس کے وجود کا جواز نہیں ۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کرسکتے ہیں ۔ مثلاً جرائم پیشہ اقوام ۔ گداگر ۔ جواری ۔ بردہ فروش ناجایز اشیاء کی درآمد اور برآمد کرنے والے وغیرہ ۔ نیز علم الاعداد سے یہ نظر آتا ہے کہ ان کی تعداد گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جارہی ہے ، جب ہم اس کو روک نہیں سکتے تو اس میں کیا مضایقہ ہے کہ ان کو زیادہ کارآمد بنایا جائے ۔ ظاہر ہے کہ یہ دلیل کتنی بودی ہے کچھ گروہ ہمارے لئے مفید ہیں ، کچھ مضر ۔ جو مضر ہیں انھیں ختم ہی کردینا بہتر ہے ، چاہے ان کی تعداد کچھ ہو ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مولویوں کا تعلق بھی خدانخواستہ گداگروں یا جواریوں وغیرہ کے گروہ سے ہے ۔ ایک خاص حلقے کے مولویوں کے بارے میں تو یہ درست ہے لیکن عام طور پر مولویوں کی ذات سے فایدہ بھی پہونچ سکتا ہے ۔ اگر اس کا یقین ہوجائے تو اسے برملا کہنے کی ضرورت ہے ۔ اس طرح کے جملے کہ "وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں" یا "اس میں کیا ہرج ہے کہ انھیں زیادہ بکار آمد بنایا جائے" احساس کمتری کا اظہار کرتے ہیں ۔ اب تک ہم نے مولویت کو ایک پیشہ سمجھ رکھا ہے اور بغیر کسی مقصد کے مولویوں نے عوام پر اپنی حکومت قایم کر رکھی ہے ۔ یہ لوگ ہمارے کمزور اقتصادی نظام پر ایک بوجھ ہیں ۔ بقول شبلی وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ اس "کسی نہ کسی طرح" کی تشریح ضروری نہیں ۔ اس میں تعویذ ، گنڈے ، فال ، اولاد پیدا کرنے کی ترکیبیں ، تحائف اور اسی طرح کی بہت سی شامل ہیں ۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔ "اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بے کار بتاتے ہیں وہ بھی تسلیم کریں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے"[3] غرض یہ ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں بیکار بھی ہیں یا اگر

---

[1] مقالات شبلی سوم ۔ صفحہ ۔ [2] مقالات شبلی سوم ۔ تعلیم قدیم و جدید

ان سے کوئی فایدہ ہے تو وہ اس قدر بعید، خفیف اور دوراز کار، کہ اس سے اُلٹے نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری، جہالت یا تعصب۔ مولوی بھی اسی طرح بے کار ثابت ہوسکتے ہیں اگر ان کی اقتصادی ضروریات پوری نہ ہوں اور انھیں جدید علوم یا سائنس میں خواہ مخواہ اور بے سمجھے بوجھے ٹانگ اڑانے کا اختیار دیدیا جائے۔ غضب تو یہ ہے کہ شبلی ان مولویوں کا مقابلہ برہمنوں سے کرنے لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"یہ کہنا غلط ہے کہ ہر شخص جو عضو معطل ہو وہ اسی طرح فکرِ معاش کرے جیسا کہ وہ گروہ جو کام کرنا چاہتا ہو۔ اسکو مطمئن کرنا اور اس کو اپنی ضروریات سے آزاد کرنا یہ تمھارا فرض ہے۔ ہندوؤں نے برہمنوں کے ساتھ کیا کیا؟ اُنھوں نے برہمنوں کا ایک فرقہ بنایا۔ برہمن کوئی ذات نہیں تھی۔ ہندوؤں نے اس قدر عمدہ تقسیم کی تھی کہ میں نثار ہو جاتا ہوں اُنکے اس مسلک پر۔۔۔"[1]

بڑی اُلٹی منطق ہے۔ آپ ایسے گروہوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں جو بقول آپ کے عضو معطل ہوں اور آپ کو اس میں قباحت نہیں نظر آتی کہ قوم میں ذات پات کی تفریق ہو۔ حالانکہ کسی ایسے گروہ کو جو اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کا دستِ نگر ہو زندہ رہنے کا حق بہت کم ملتا ہے اور ہمارے ملک کے موجودہ افلاس کے پیش نظر ایسے گروہوں کا وجود معاشی ہی نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔

مولویوں کی اس گروہ بندی کے پسِ پردہ جو اقتصادی اسباب تھے وہ اگرچہ اہم تھے لیکن یہ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم انھیں وجوہ کو کافی مان لیں اور اس کے پیچھے جو معاشرتی اور سیاسی رجحانات تھے انھیں نظر انداز کردیں۔ نیا متوسط طبقہ جو انگریزوں کے اثر سے وجود میں آیا تھا علم کے بارے میں اس کا کیا نقطۂ نظر تھا؟ وہ علم کو محض علم کی خاطر حاصل نہیں کرتا تھا بلکہ اسے اپنے اغراض و مقاصد کا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ وہ اسے معاش اور دنیوی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ انگریزوں سے پہلے تعلیم لازم نہیں تھی۔ ہاں اگر کوئی شخص اسے مقررہ حدود سے زاید حاصل کرلیتا تو ایک خاص حلقے میں اس کی عزت کی جاتی تھی انگریزوں کے عہد میں جدید تعلیم کس طرح حکومت کے استحکام کا ایک ذریعہ بن گئی، اس کی تاریخ اس جگہ دہرانا مقصود نہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے حکومت کو مستحکم کرنے میں انگریزوں کی مدد کی اُنھیں حکومت کا مربیانہ تعاون حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی مگر یہ تعلیم عوام کے دلوں تک نہ پہنچ سکی اور متوسط طبقے میں بھی جہاں اس کی کامیابی کی امید تھی اس کا تناسب بقدر ضرورت نہ ہوسکا۔ ہندوستان اور پاکستان میں تعلیم ویسے ہی کم ہے، اور جہاں ہے، وہاں کچھ غربت اور کچھ عصبیت کے باعث، اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کی تکمیل کے لئے خاص لمبی مدت درکار ہوتی ہے جس میں ایک خاندان پر نہ جانے کتنے انقلاب گزر جاتے ہیں، ایک ہی خاندان کے سب افراد اس سے یکساں طور پر مستفید نہیں ہو پاتے چنانچہ جن لوگوں نے ہمت کرکے اپنے نورچشموں کو یہ تعلیم دلائی وہ قدرتی طور پر ان کے مستقبل کی بابت لذیذ خوش فہمیوں میں مبتلا ہوگئے۔ ان حالات میں نیا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی تعلیم کی نسبت ذرا اور حساس ہوگیا۔ اس نے اچانک اپنے سارے طور طریقے بدل دئے۔ وہ حکام کے ساتھ میل جول رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا، سرکاری ملازمت اس کے تخیل کی معراج بن گئی تھی۔ خوشامد، سازش، حکام رسی اور مصلحت بینی اُس کے وہ حربے تھے جنھیں لیکر وہ زندگی میں داخل ہوتا اور آخرکار خود انھیں حربوں کا شکار ہو جاتا۔ اُس نے مغربی طرزِ بود و ماند کا سطحی مشاہدہ کیا تھا اور اس کے بعض اصول اُسے ازبر تھے۔ مگر وہ خود ان پر عمل بہت کم کرتا تھا۔ اس تعلیم یافتہ گروہ کو شبلی نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اسی کے ذریعہ سے اُن کی رسائی مغرب تک ہوئی تھی۔ اُن کے تعلقات انگریزوں سے بھی تھے اور ان انگریز نما ہندوستانیوں سے بھی۔ اگرچہ بعد میں وہ دونوں سے متنفر ہوگئے تھے اور اگرچہ دونوں کی ظاہری تہذیب میں جو پوشیدہ حیوانیت تھی، ان کی

---

[1] خطبات شبلی۔ "تحفظ مذہب"

باتوں میں جو خود غرضی کی بو تھی، ان کے جلسوں اور کلب گھروں میں جو "کوٹ پتلون کی نمایش" تھی وہ ان کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی لیکن وہ صحیح طور پر ان اسباب کا کھوج نہ لگا سکے جو اس کے لئے ذمہ دار تھے۔ اپنی تنقید میں انھوں نے عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیا۔ اُن کا مشاہدہ سچا تھا، تجزیہ سچا نہ تھا۔ اُنھوں نے ہندوستان کے طبقۂ اوسط کے افلاس اور احساسِ شکست کو نظر انداز کر دیا اور اُن مجبوریوں اور معذوریوں کو نہ دیکھا جو اس افلاس اور کس مپرسی اور جھوٹی اقدار کو برقرار رکھنے کی کوشش کے باعث نئے نوجوان پر چاروں طرف سے مسلّط تھیں۔ انھوں نے لارڈ میکالے کی اس اسکیم کو نہ سمجھا جس کا مقصد ہندوستان میں حکومت کی مشینری کے لئے اچھے کلرک مہیا کرنا تھا۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ تہذیب کی اس اندھی کشاکش کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ ایک فرد کو دوسرے فرد سے اور ایک انا کو دوسری انا سے جدا کرنا تھا۔ اس تہذیب میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ افریقہ ہندوستان سے۔ شبلی نے اپنے فرزند کے نام ایک خط میں انگریزی دانوں کی حرص کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اول تو یہ بات کچھ انگریزی پڑھنے والوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر طبقے میں ملتی ہے، پھر اس کی وجہ کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ معاشرت جس کی بنیاد در اصل ایک طرح کے سخت مقابلہ اور مسابقت پر رکھی گئی ہے اس میں ایک فرد کی کامیابی دوسرے کے دل کا کانٹا اور ایک کی شکم سیری دوسرے کی گرسنگی ہے۔ اس میں گھر کے بنانے والے کم ہیں، جلنے کا تماشہ دیکھنے والے زیادہ اس باہمی مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی حالات کو حاصل ہے یہ اقتصادی حالات مغربی سرمایہ داروں کی اُس بہیمانہ زر اندوزی سے متعلق ہیں جو تین سو سال سے ہندوستان کو لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف ہے۔ اس غیر ملکی طاقت، اس کی خود غرضی اور وحشیانہ استحصال کو شبلی نے محسوس نہیں کیا اور اسی وجہ سے انگریزی دانوں کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا شبلی کا علماء پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے علماء کو جدید علوم سے آشنا کرایا۔ لیکن یہ بھی محض تبرک ہی تبرک تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے جن سے زیادہ معتبر راوی اور کوئی نہیں ہو سکتا "حیات شبلی" میں لکھا ہے کہ شبلی کا مقصد یہ تھا کہ "پہلے جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہئے۔ پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہئے"۔ جہاں تک مسلمان بنانے کا سوال ہے، اس مفروضے کے ماتحت اس کے امکانات بے حد بڑھ جاتے ہیں اور تصوف سے لیکر ریڈیو، ایٹمی بم اور بینکنگ کے تازہ ترین اصولوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جس چیز کو چاہئے اسلام لانے پر مجبور کیجئے۔ (ہمیں تو بہر حال آپ کے "فتووں کے آگے سر جھکانا" ہی پڑے گا) اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا شبلی کے نزدیک یہ جدید علوم بذات خود اہم نہیں تھے۔ ان کی اہمیت اس بات میں تھی کہ وہ مذہبی عقاید کی کس حد تک تائید کرتے ہیں۔ جہاں یہ تائید ختم اور اختلاف شروع ہوا وہاں ان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر ان کی تردید شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ "جدید علوم و مسایل سے اُن کی واقفیت بھی محض سُنی سنائی ہی تھی"۔ (حیات شبلی۔ مقدمہ) اس کھینچا تانی سے جہاں خود مولانا کی کم نظری ظاہر ہوتی ہے، وہاں دوسری طرف جدید علوم کو بھی بے اندازہ نقصان پہونچ سکتا ہے، اور تیسری طرف علماء میں مولانا کی طرف سے برہمی پیدا ہوتی ہے جس کا ایک واضح ثبوت خود ندوہ سے مولانا کی علٰحدگی ہے۔

مفتون احمد

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔ منیجر نگار

سائنس کے نظر نہ آنے والے آلات

اس وقت ماہرین سائنس جن آلات سے کام لیتے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے، اور ان میں سے بعض آلات اتنے نازک اور اس قدر چھوٹے ہیں کہ نگاہ انھیں دیکھ بھی نہیں سکتی۔

بہ ظاہر یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب کوئی آلہ نظر ہی نہیں آتا تو اس سے کام کیونکر لیا جاسکتا ہے، لیکن سائنس کی دنیا میں بہت سی وہ باتیں جنھیں ہم ناممکن سمجھتے ہیں ممکن ہوجاتی ہیں اور انھیں میں سے ایک ایجاد ان خورد بینی آلات کی بھی ہے، جن کی مدد سے قدرت کے بہت سے وہ راز جو آج تک پوشیدہ تھے، ظاہر ہوتے جارہے ہیں۔

مثلاً سرطان کے جراثیم، آٹم کے جوہری ذرات یا خود تخلیقِ حیات کے اسباب کہ اس وقت تک ان کی کامل تحقیقات نہ ہوسکی تھی لیکن اب ان خورد بینی آلات کی مدد سے معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔

جراثیم کی حقیر جسامت اور ان کی کثرت کا اندازہ آسان نہیں۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ ایک اِنچ لکڑی کے ٹکڑے کو آپ ۲۵ ہزار حصوں میں تقسیم کردیں تو ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا حالانکہ جراثیم کی جسامت اتنی ہی بلکہ اس سے بھی کم ہے، اسی کے ساتھ جب آپ ان کی کثرتِ تعداد پر غور کریں گے تو اس سے زیادہ حیرت ہوگی۔ پانی کے ایک قطرہ کی کیا حیثیت ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس ایک قطرہ میں کتنے مختلف جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ہزار دو ہزار نہیں، لاکھ دو لاکھ نہیں بلکہ کم ازکم ۱۰ لاکھ سے ۲۰ لاکھ تک، پھر غور کیجئے کہ ایسے خورد بینی جراثیم کو ایک دوسرے سے علحدہ کرنا، ان کے مختلف گروپ متعین کرنا اور ہر ہر جرثومہ کو اس کے گروپ سے جدا کرکے اس پر عمل جراحی کرنا، کس قدر دقیق و مشکل کام ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے نازک کام کے لئے آلات بھی ایسے ہی نازک ہونا چاہئے اور اب سائنس نے ایسی خورد بینی آلات اور خورد بینی نشتر طیار کرلئے ہیں جن کی مدد سے ایک جرثومہ پر بھی عمل جراحی ہوسکتا ہے۔

اس قسم کے خورد بینی آلات طیار کرنے کا خیال اب سے ایک صدی قبل لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی تکمیل سو سال بعد ایک فرانسیسی سائنس داں کی قسمت میں لکھی تھی۔

یہ بات عرصہ سے معلوم تھی کہ اگر کانچ کو گرم کرکے اس کا تار کھینچا جائے تو وہ اس حد تک بڑھایا جاسکتا ہے کہ نگاہ کو نظر نہ آئے اور اس تار سے سوئیاں وغیرہ بنائی جاسکتی تھیں، لیکن سوال یہ تھا کہ اس نظر نہ آنے والے تار سے نظر نہ آنے والے آلات طیار کیونکر کئے جائیں۔

سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں فلاڈلفیا کے ایک ڈاکٹر ہنری شمدٹ نے ایک مشین ایسی طیار کی جس سے کانچ کے خورد بینی اوزار و آلات طیار کرنے کا امکان پیدا ہوا، لیکن یہ مشین زیادہ نازک نہ تھی اور چونکہ ہاتھ ہی کی مدد سے اس کو چلایا جاتا تھا، اسلئے زیادہ خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تاہم مشق و مزاولت سے کانچ کے بعض آلات ضرور ایسے طیار ہوسکے جو پہلے موجود نہ تھے اور ان کی مدد سے موجودہ صدی کے آغاز میں ایک ماہر حیاتیات بڑے بڑے خلایا (cells) پر عمل جراحی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس وقت یہ ماہر حیاتیات اپنے عمل جراحی کا مظاہرہ کر رہا تھا تو تماشائیوں میں ایک فرانسیسی سائنس داں پری ڈی فان برون بھی موجود تھا۔ یہ حیاتیات کے

مطالعہ کا بڑا شایق تھا، اس کو اس ایجاد میں بڑے امکانات نظر آئے اور اس نے ارادہ کرلیا کہ اپنی زندگی ان خوردبینی آلات کی طیاری میں صرف کردے گا۔

اس کے سامنے دو مسئلے تھے ایک یہ کہ زیادہ بہتر خوردبینی آلات طیار کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ آلات و اوزار ہر قسم کے ہوں تاکہ ان کی مدد سے ہر قسم کی تحقیقات ہوسکے۔ اس نے کامل ۶ سال اس کوشش میں صرف کردئے اور آخرکار وہ ایک ایسی خوردبینی بھٹی طیار کرنے میں کامیاب ہوگیا جس میں یہ خوردبینی اوزار و آلات طیار ہوسکتے تھے۔ یہ بھٹی کیا تھی؟ پلاٹنم کا ایک نہایت ہی چھوٹا سا تار جس کے سرے کو ایک چھوٹی سی دھونکنی کی مدد سے مختلف درجات حرارت تک گرم و روشن کیا جاسکتا تھا اور اس کی مدد سے کانچ کے تار کو کھینچ کر خوردبینی اوزار طیار ہوسکتے تھے یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ دنیائے سائنس فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس ایجاد کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج دنیا میں یہ خوردبینی بھٹیاں ۲۰۰ کی تعداد میں پائی جاتی ہیں جن کی مدد سے ایک ماہر پندرہ منٹ میں ایک درجن اوزار سادہ ساخت کے طیار کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مشکل یہ سامنے آئی کہ ہاتھ کی حرکت پر کیونکر اتنا قابو حاصل ہوسکتا ہے کہ اس کی مدد سے یہ خوردبینی اوزار طیار ہوسکیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ اگر انھیں ایک سوئی ایسی طیار کرنا ہے جس کی جسامت $\frac{1}{25000}$ انچ ہو تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہاتھ کسی آلہ کو اتنی نازک حرکت دے سکے۔ اس مشکل کو موجد نے ایک اور مشین کی مدد سے دور کیا اور کچھ ایسا حساب رکھا کہ اگر اس مشین کو ایک انچ حرکت دیجائے تو اوزار بنانے والے آلہ میں $\frac{1}{1500}$ انچ سے زیادہ حرکت پیدا نہ ہو۔ الغرض یہ فرانسیسی سائنس داں اپنی کوشش میں اس قدر کامیاب ہوا اور اس کی خوردبینی بھٹی اور خوردبینی آلات و اوزار بنانے والی مشین اتنی مقبول ہوئی کہ ساری دنیا میں اس کی مانگ شروع ہوگئی اور اسے ایک مستقل کارخانہ قایم کرنا پڑا۔ جن میں خوردبینی نلکیاں، سوئیاں، کانٹے، چمٹیاں، نشتر اور ہتوڑیاں طیار ہوتی ہیں اور ان کی نظر آنے والی جسامت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک خوردبینی ہتوڑی کے سرے کا قطر ایک انچ کے ڈھائی لاکھویں ($\frac{1}{250000}$) حصہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ان خوردبینی آلات و اوزار سے جو فواید دنیائے سائنس کو پہونچے ہیں، ان کا بھی سرسری ذکر سن لیجئے!۔

آپ نے ایک پودھا دیکھا ہوگا جسے ہم کوکرمتا کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے کہتے ہیں۔ یہ وہاں بڑی مقبول ترکاری ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں جن میں سے بعض بدمزہ اور محض خوش ذایقہ ہوتی ہیں۔ لیکن اسوقت تک ماہر نباتیات اس باب میں کامیاب نہ ہوسکے تھے کہ وہ صرف خوش مزہ پیدا کرسکیں، کیونکہ یہ ترکاری خود رو قسم کی ہے اور ان بیشمار ریشوں سے پیدا ہوتی ہے جن میں خوش مزہ اور بدمزہ سبھی قسم کے ریشے ملے جلے ہوتے ہیں۔ یہ ریشے اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ ایک لاکھ ریشوں کا گچھا بھی خوردبین میں ایک نہایت ہی حقیر سا دھبا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ریشوں میں سے صرف خوش مزہ ریشوں کو چھانٹ لینا محال تھا، لیکن اب خوردبینی چمٹیوں کے ذریعہ سے یہ مشکل حل ہوگئی اور اس طرح صرف خوش مزہ کی کاشت آسان ہوگئی۔

ڈبل روٹی بنانے میں خمیر کی نوعیت کا اندازہ بڑا مشکل کام ہے۔ جس چیز کو خمیر کہتے ہیں وہ در اصل نباتاتی خلایا کا ایک گچھا ہے جو آٹے یا میدہ میں پیدا ہوجاتا ہے اور یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ نصف انچ خمیر میں ۱۵ ارب خلایا سے کم نہیں پائے جاتے۔ ان میں بعض خلیے ( ) پختہ ہوتے ہیں، بعض خام، اور کام کے خلیے وہی ہیں جو پختہ ہوں، لیکن ان کو خام خلیوں ( ) سے علحدہ نہیں کرسکتے تھے۔ اب ان خوردبینی آلات کی مدد سے یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ خمیر کے صرف عمدہ اور پختہ خلایا علحدہ کرلئے جائیں اور انھیں کی مدد سے عمدہ روٹی طیار کی جائے۔

نادر وبیش قیمت دھاتوں کے استعمال کے سلسلہ میں بھی ان خوردبینی آلات سے بہت فایدہ اٹھایا جارہا ہے۔ مثلاً ایک

ایک دھات ہے پلوٹونیم (Plutonium) ہے جو سائنس کے تجربات کے لئے بہت ضروری ہے، لیکن اس کی موجودہ مقدار اتنی کم ہے کہ اس سے زیادہ فایدہ نہیں اُٹھایا جاتا، لیکن اب خوردبینی اوزار کی مدد سے اس کے باریک ذرات کئے جاسکتے ہیں اور ان سے سائنسی تجربات میں زیادہ وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔

دنیائے طب میں ان خوردبینی آلات کی مدد سے بڑا زبردست فایدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جدید طریق علاج میں Serum اور Vaccine کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یعنی جن جراثیم سے جو بیماری پیدا ہوتی ہے، انھیں سے سیال مادہ طیار کرکے مریض کے خون میں پہونچانا۔ لیکن کسی خاص مرض کا بہترین سیرم یا ٹیکہ طیار کرنا اس پر منحصر ہے کہ صرف انھیں جراثیم سے مادہ طیار کیا جائے، جو کسی مخصوص مرض کے پیدا کرنے والے ہیں، لیکن یہ بہت مشکل ہے، کیونکہ جراثیم کے جس جھنڈ سے یہ مادہ طیار کیا جاتا ہے اس میں سبھی قسم کے جراثیم ہوتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کرسکتے، لیکن اب ان خوردبینی اوزار کی مدد سے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جراثیم کے اس جھنڈ سے ہم صرف مخصوص امراض کے جراثیم چن لیں اور انھیں کا خالص سیرم طیار کرکے جلد از جلد مرض کا ازالہ کرسکیں۔

اعصابی امراض کا تعلق اعصابی ریشوں سے ہے اور یہ ریشے اس قدر باریک ہیں کہ ایک ریشہ کا قطر ایک انچ کے پانچ ہزارویں ($\frac{1}{5000}$) حصہ کے برابر ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ان ریشوں کا ایک دوسرے سے جدا کرنا آسان نہیں لیکن اب خوردبینی اوزار سے ایک ایک ریشہ کو علٰحدہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ کس حد تک مجروح ہے اور اس کا ازالہ کیونکر ممکن ہے۔

اسی طرح خون کی بیماریوں کے ماہرین اب ان خوردبینی اوزار کی مدد سے خون کے ہر ہر سرخ ذرہ کو علٰحدہ کرکے اور ان کے اندر ملیریا وغیرہ کے جراثیم داخل کرکے صحیح نتائج کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

ان آلات کی مدد سے کام لیکر اب سرطان کے ایک ایک خلیے (Cell) کو علٰحدہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ دوسرے خلیّوں سے کیا اختلاف رکھتا ہے اور اس کا نشو و نما کیوں اس قدر جلد ہوتا ہے۔

"نگار" کے حسب ذیل پچھلے مکمل فایلوں کی صرف ایک ایک جلد موجود ہے :-

۳۲ء	(مع غالب نمبر)	بیس (۲۰) روپے
۳۶ء	(مع ہندی شاعری نمبر)	بیس (۲۰) روپے
۳۷ء	(مع اصحاب کہف نمبر)	پندرہ (۱۵) روپے
۴۶ء	(مع انتقاد نمبر)	پندرہ (۱۵) روپے
۴۷ء	(مع ماجد ولین نمبر)	پندرہ (۱۵) روپے

منیجر نگار لکھنؤ

داغ کی شاعری کے صحتمند عناصر

داغ قدیم رنگِ سخن کے ممتاز شعراء کی آخری یادگار تھے۔ اُنھوں نے دلی کی پرانی معاشرت کے انحطاط و انتشار اور اُردو غزل کے بلوغ و شباب کا بہت قریب سے اور براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔ اُن کی شاعری کا سراغ، اُن کی افتادِ طبع اُن کے سماجی حالات، اور دلی، رامپور اور حیدرآباد کی اُس عام کلچرل زندگی میں ڈھونڈا جاسکتا ہے، جہاں سے اُن کے تخیل اور اُن کے فنی مواد نے قوت حاصل کی تھی۔ داغ کے یہاں روزمرہ کی جو صفائی، بندش کی جو چستی، طرز ادا کی جو شوخی اور بانکپن، معاملاتِ حسنؔ عشق میں جو طراری اور تیکھاپن، اظہار میں جو تنوع اور مشاقی نظر آتی ہے، اُس میں ذوق کی شاگردی، قلعۂ معلّٰی کی سہل پسند فضا اور رام پور کی ادبی سرگرمیوں کو بڑا دخل ہے۔ آج جب کہ زندگی اور زمانہ کا رخ دگرگوں ہوچکا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں، جس کے مسایلِ حیات وفن، اُس دور کے مسایل سے یکسر مختلف ہیں، جن میں داغ، امیر اور جلال کا طوطی بول رہا تھا، تو ہمیں اس امر پر ایک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ آخر اُس زمانہ کی شاعری میں جذبات کا وہ تنوع (multiplicity) اجتماعی زندگی کی باطنی کشمکش کا وہ عکس، اور انفرادی روح کی اُلجھنوں اور اُس کے کرب وغم کا احساس کیوں نہیں ملتا، جس کی ہم جدید شاعری میں اس درجہ جستجو کرتے ہیں۔ دراصل یہ استعجاب ایک غلط طریقۂ کار کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخی شعور کی غیرموجودگی میں کسی شاعر کے سرمایہ کا احتساب کیا جاتا ہے، آج شعروادب کے اسالیب ہی نہیں بدل گئے ہیں بلکہ وہ واضح اور معین حالات بھی تبدیل ہوگئے ہیں، جو ادبی اسالیب کو جنم دیتے ہیں اور قدیم کے ڈھانچ کو ایک قابلِ فہم شکل عطا کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادب میں بنیادی اور عالمگیر قدروں کا وجود نہیں ہے یا اُن کی تلاش بے سود ہے۔ لیکن یہ قدریں معین اور مخصوص حالات ہی میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی اور ہمارے ادراک کی گرفت میں آسکتی ہیں۔ حسن وعشق کے جذبات بنیادی اور ناقابلِ تغیر ضرور ہیں۔ لیکن اُن کی تعبیر وتفسیر اور مصوری میں نازک فرق کچھ تو ادیب اور شاعر کی انفرادی استعداد وبصیرت کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ اُن مادی حالات کے تغیر وتبدل سے جو بنیادی جذبات کی وسعت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

داغ کی شاعری کو چوچلے اور بوالہوسی کی شاعری کہکر اُس کی اہمیت کو کم کرنے کی جو کوشش ہم کرتے رہے ہیں، اُس کے تین اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ داغ کی شاعری کا وہ حصہ (اور اس حصہ کا حجم کافی ہے) جو حیدرآباد میں اُس وقت لکھا گیا، جبکہ معاشی آسودگی شہرت اور ذہنی اطمینان نے داغ کی تخلیقی صلاحیتوں میں ٹھیراؤ پیدا کردیا تھا، یہ واقعی اس قدر کم وزن اور سطحی ہے کہ اُسے ایک طرح کی لفظی بازیگری سے زیادہ اہمیت نہیں دیجاسکتی۔ دوسرے یہ کہ داغ نے جس مخصوص معاشرت میں آنکھیں کھولیں، اُسمیں زندگی کی بنیادی اور ہمہ گیر قدریں محض ایک نشان ہوکر رہ گئی تھیں۔ جنھیں لوگوں نے تبرک کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ بھرپور زندگی بسر کرنے کے لئے جن سرشار تجربوں، جس گہرے علم، جس سچی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، اُس سے پوری اجتماعی روح غیر آہنگ ہوچکی تھی اسی سلسلہ میں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ رام پور کے مشاعروں اور اُن ہم طرحی غزلوں کی مسابقت نے جو گلدستہ کے لئے لکھی جاتی تھیں اور جن میں رام پور کے تمام شعراء حصہ لیتے تھے، اگر ایک طرف داغ کی فن کارانہ صلاحیتوں کو اُبھارا اور چمکایا، تو دوسری طرف مواد کے اُن عناصر کی جانب سے اُن کی توجہ رفتہ رفتہ اور بھی کم کردی، جو پہلے بھی بافراط موجود نہیں تھے۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ

اگر کسی شاعر کو کسی خاص زمین میں محض اپنے حریفوں پر بازی لے جانے اور اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھانے کے لئے غزلیں کہنی پڑیں، تو اُس کے تخیل کے سوتے بہت جلد خشک ہوجائیں گے۔ بجز اس صورت کے کہ اُس کے تخیل میں غیر معمولی رچاؤ، ندرت اور طرفگی موجود ہو، اور اُس کے تجربات و مشاہدات اس حد تک مربوط و منظم ہوگئے ہوں کہ وہ بآسانی مختلف قافیوں کے قالب میں ڈھل جائیں تیسرے یہ کہ شاعری کی تنقید میں ہم ابھی تک پیوریٹن (Puritan) معیاروں کو برتتے رہے ہیں، اسی لئے جب ہم کسی ایسے شاعر پر تنقید کرنے بیٹھتے ہیں، جس نے اپنے کلام میں جسم کی لذتوں اور جنسی تجربوں کو بغیر کسی ذہنی پس وپیش کے اور ایک حد تک جرأت و بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہو، تو ہم اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور ایسی شاعری کو قابلِ حقارت سمجھنے لگتے ہیں۔ میری رائے میں کسی شاعر کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر کرنا کہ وہ خالص روحانی یا خالص جسمانی تجربوں کا بیان ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ انسانی جذبات اور تجربے سادہ اور بے رنگ نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے تو اُس پیوریٹن اندازِ فکر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے۔ جو مادی زندگی کی تمام نعمتوں کو انسان پر حرام کردیتا ہے۔ اُس کے بعد یہ غور کرنا چاہئے کہ جن تجربات سے ایک فنی کارنامہ پیش کیا جاتا ہے، وہ حقیقی ہیں یا محض روایتی، پھر یہ بھی دیکھنا ازبس ضروری ہے کہ شاعر نے اُن تجربات کے معنی خیز پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، یا صرف ضمنی، سطحی اور ذاتی پہلوؤں کو۔ میرا خیال ہے کہ تنقید کے ان اصول کو نظر انداز کردینے کی وجہ سے داغ کی شاعری پر کوئی ایسا متوازن فیصلہ نہیں ہوسکا، جو اُن کی شہرت کی جائز بنیادوں کی طرف متوجہ کرتا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہے کہ داغ کی شاعری کا معتد بہ حصہ محض بازیگری ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ داغ کے تجربات میں اکثر اُس خلوص، اُس لگن اور اُس شدت کی بھی کمی ہے، جو کامیاب عشقیہ شاعری کے لئے لازم ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُن کے یہاں ہمیں ایسا چوچلا، ایسی لذتیت اور ایسا گھامڑپن ملتا ہے، جس سے سنجیدگی آنکھیں چراتی ہے۔ تاہم میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس دل لگی، چھیڑ چھاڑ اور بذلہ سنجی کے نیچے ایک تہ ایسی بھی ہے، جسے صحت مندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

داغ کی شاعری میں زبان و بیان کا جو مزہ اور واردات قلب کا جو رنگین و شگفتہ اظہار ہے، اُس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ یہ کارنامہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اور یہ تسلیم کرنے میں کسی کو مطلق تامل نہیں ہوگا۔ کہ اُردو زبان کے ارتقا میں داغ کا بڑا حصہ ہے۔ غزل کے اسالیب میں تراش و خراش کا جو سلسلہ برابر جاری رہا۔ اُس میں داغ کی شاعری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو ادیب و شاعر اُردو زبان میں ہیرے کی سی چمک، اور موسیقی کا سا رس پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں اُن میں داغ کا نام ضرور شامل کرنا ہوگا۔ داغ کو اپنی اس قنوطیت کا خود بھی بڑا احساس تھا، چنانچہ اُس نے اپنے کلام میں جابجا اپنی فصاحت اور زبان دانی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ داغ کی مضمون آفرینی کو بھی سراہا گیا ہے لیکن اظہار بیان اور خیال میں جو نامیاتی رشتہ ہوتا ہے، اُس کے پیشِ نظر داغ کے کمال کا اعتراف شاید ابھی تک نہیں کیا گیا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر وہ شاعر جسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو، لازمی طور پر معنوی اعتبار سے بھی وزن و وقار رکھتا ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم شاید آج ذوق کی بھی اتنی ہی قدر کرتے، جتنی اُن کے معاصرین غالب اور مومن کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ داغ کے اچھے اشعار وہی ہیں، جن میں روزمرہ کی صفائی و برجستگی، مضمون کی جدت و خوبی کے ساتھ گھل مل گئی ہے۔ داغ غزل لکھنے میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرتے تھے، نہ اُن کے کلام میں ہمیں معنی و مفہوم کی وہ سطحیں نظر آتی ہیں جو بڑے شاعروں کا طرۂ امتیاز ہیں، لیکن محدود معنی میں مضمون آفرینی اُن کے اچھے اشعار میں ہمیں ضرور ملتی ہے۔ وہ اعلیٰ شاعرانہ جوہر جو کسی تجربہ کے متنوع و متضاد پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے، اُن میں نہیں تھا، اُن کے تجربات میں بھی فراوانی و وسعت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے مشاہدات میں تازگی و طرفگی نظر آتی ہے۔ جدت آفرینی کے متعلق ہمارا نظریہ ابھی تک کچھ میکانکی سا رہا ہے۔ بجز اُن شاعروں کے جو کسی مشہور شاعر کی کسی خاص غزل پر غزل لکھتے ہیں۔ کوئی اچھا شاعر اپنے پیشروؤں یا ہمعصروں پر تلاشِ

مضمون کے سلسلہ میں سبقت لے جانے کی ارادی کوشش نہیں کرتا - بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کہیں کہیں ایک شاعر کے تجربات، دوسرے شاعر کے تجربات سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں، اور جب دو شاعر تقریباً یکساں اور متوازی تجربات بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اپنے علم، مشاہدہ اور وجدان کے لحاظ سے اس بیان میں اشاریت پیدا کرسکتے ہیں اور اسی بنیاد پر ہم اُن کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین کرتے ہیں - داغ کی شاعری کا مرکز و محور حسن و عشق کے جذبات و معاملات ہیں - اُن غزلوں اور اشعار سے قطع نظر جو بغیر کسی زبردست محرک کے، محض مشق یا مقابلہ کے خاطر لکھے گئے ہیں، داغ کے اچھے اشعار کو پڑھکر ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیش پا افتادہ مضامین میں ایک نوع کی جدت اور لطف پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں - مثال کے لئے یہ اشعار دیکھئے :-

دل میں لے دے کر رہا تھا ایک قطرہ خون کا — کچھ نثارِ غم ہوا، کچھ صرفِ مژگاں ہوگیا،
نہ پوچھئے مرے روزِ سیاہ کی ظلمت — چراغ لے کے بھی ڈھونڈا، تو آفتاب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف — ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا،
دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے، وہ ایسے کہاں کے ہیں
جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشتِ خاک — اُس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں
کیا رشک ہے کہ طالبِ ہجراں ہوں اس لئے — جو مجھ کو ہے رقیب کو وہ آرزو نہ ہو
تم آئینہ ہی دیکھ کے حیران رہ گئے — واللہ میرے دل میں اک ایسا ہی اور ہے
قاتل نے دیکھے اس میں ہزاروں پری جمال — دل چاک کیا ہوا کہ پری خانہ کھل گیا
شباب آنے نہ پایا کہ عشق نے مارا — یہاں بہار کے لالے پڑے خزاں کیسی
ہم دل کی بات داورِ محشر سے کیا کہیں — یہ راز کہ کے اُس بتِ کافر سے کیا کہیں

داغ اور ان کے معاصرین کی شاعری پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس میں تصنع زیادہ ہے اور واقعیت بہت کم - یہ الزام بالکل غلط تو نہیں، لیکن ایک حد تک مبالغہ آمیز ضرور ہے - در اصل اس مسئلہ پہ کوئی صحیح رائے قائم کرنے کے لئے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے - اول تو یہ کہ یہ الزام دلی کے شاعروں سے کہیں زیادہ لکھنؤ کے شاعروں پر عاید ہوتا ہے - دلی کی شاعری میں جذبہ کی صداقت اور اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں روایت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے - صرف آتش اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ظاہر ہے کہ جس معاشرت میں اصل جذبات کی جگہ صرف اُن کی روایت بروئے کار ہو، وہاں خارجیت اور سطحیت کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہے - اور جب جذبات نگاری کی بجائے صرف قافیہ پیمائی شاعروں کا شعار ہوکر رہ جائے، تو اعلیٰ اور کامیاب عشقیہ شاعری کے محاسن کا، جو عبارت ہیں جذبات کی شدت و خلوص سے شاعر کی کائناتِ شعری سے خارج ہوجانا چنداں محلِ حیرت نہیں - دوسرے یہ کہ اُن جنسی تجربات کی نوعیت جن پہ بیشتر شاعروں کے کلام کی بنیاد قایم ہے یکسر بدل گئی ہے - اس تبدیلی کا براہ راست تعلق مادی حالات کی تبدیلیوں سے ہے - عورت اور مرد کے تعلقات کا تجزیہ اب ہم پردوں میں چھپائے بغیر کرتے ہیں - یہ بہت ممکن ہو کہ جس خامی کو ہم تصنع سے تعبیر کرتے ہیں وہ ان شاعروں کے تجربات کی خامی نہ ہو، بلکہ اُس معاشرت کی کمزوری ثابت ہو، جو مرد اور عورت کے تعلقات کو ایک غیر حقیقی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتی تھی - داغ کے متعلق یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے - کہ ان کا عشق وہی عشق ہے، جو اُسی زمانہ کے شرفاء طوائفوں سے کیا کرتے تھے - آزاد جنسی محبت کی یہی ایک شکل تھی، جو اُس سماج میں رائج تھی - داغ کے یہاں جو دل لگی، چھیڑ چھاڑ، شوخی اور گرم گفتاری ملتی ہے - اُسے جب اس پسِ منظر میں رکھ کر دیکھئے تو وہ پر تصنع معلوم ہونے کی بجائے بہت کچھ حقیقت معلوم ہوتی ہے - رقیب کا تصور بھی محض روایتی نہیں ہے بلکہ

یہ بھی اُنہی محفلوں اور سرگرمیوں کی یاد دلاتا ہے، جو اُس زمانہ کی سوسائٹی میں بہت عام تھیں۔ یہ سب چیزیں جاگیرداری نظام سے وابستہ تھیں۔ اسی لئے داغ اور اُن کے معاصرین کی شاعری میں ہمیں اس فضا کا احساس کم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں نہ نفسیات کی موشگافیوں سے ہم روشناس ہوئے تھے، اور نہ سماجی علوم نے اتنی ترقی کی تھی، جتنی آج کرلی ہے۔ ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر غزل گو شاعر نہ اپنے جذبات کا کوئی نفسیاتی تجزیہ کرسکتے تھے، نہ انفرادی تاثرات کا رشتہ سماجی حالات سے جوڑنے کی کوشش کرتے تھے اور نہ حسن وعشق کے معاملات کو وسیع تجربہ اور گہری اشاریت کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی طرف میلان رکھتے تھے۔

اسی نقطۂ نظر سے اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ باوجود رسمی اور روایتی عناصر کے، داغ کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے، جو براہ راست تجربہ کی وجہ سے وجود میں آئے ہوں۔ اور اس لئے اُن کی شاعری کے منتخب حصہ پر تصنع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، شوخی، طراری، چنچل پن داغ کی نمایاں خصوصیات ضرور ہیں، لیکن ان میں یکرنگی نہیں ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

عرضِ وفا پہ دیکھنا اُس کی ادائے دلفریب ــــــ دل میں کچھ اعتبار سا، آنکھ میں کچھ ملال سا
یہ فتنہ آتشِ الفت کا پہونچے گا نہ محشر تک ــــــ لگی ہے آپ کے گھر میں بجھے گی آپ کے گھر سے
کسی کی آنکھ میں وہ انتظار ہوکے رہے ــــــ کسی کے دل سے شکیب و قرار ہوکے چلے
شبِ وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا، ــــــ وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے،
اُسے افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے، ــــــ سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے
جل جل کے بزمِ عشق میں گھل جائیں استخواں ــــــ مانندِ شمع لطف ہے سوز و گداز کا،
باعثِ گریہ نہ پوچھ اے ہمنشیں، ــــــ کیا کہوں میں آگیا تھا یاد کیا
ہزاروں حسرتیں وہ ہیں کہ روکے سے نہیں رکتیں ــــــ بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں
ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام، ــــــ کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے
گدازِ غم سے میری ہڈیاں گھلتی ہیں گھل جائیں ــــــ ترا ارمان تو اے دیدۂ پرنم نکلتا ہے
یہ حال تھا شبِ وعدہ کہ تا بہ راہگذر ــــــ ہزار بار گیا میں ہزار بار آیا،
کچھ رہ گیا ہے قصۂ غم وہ سنا تو دوں ــــــ کاش اُن کو نیند اور نہ آئے ذراسی دیر
کچھ ترا شوق کچھ تری حسرت ــــــ اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں
وہی دل ہے، وہی لب ہیں، وہی اندازِ نیاز ــــــ جیسی اب ہے یہ دعا بے اثر ایسی تو نہ تھی
گزرگاہِ ارماں و حسرت رہا دل، ــــــ گزرتے رہے کارواں کیسے کیسے
کبھی ہم اُس گلی میں نقشِ دیوار ــــــ کبھی اُس بزم میں تصویرِ غم کی،
ترا اک وعدۂ دیدار اور وہ بھی قیامت پر ــــــ پھر اس پر صبر اتنا ہائے دل امیدواروں کا

داغ کی شاعری کے صحت مند ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُن کے یہاں عاشق کا کردار اُس کے مروجہ کردار سے مختلف ہے۔ قطع نظر اُن اشعار کے، جہاں داغ اپنے محبوب کو جلی کٹی سناتے ہیں، ایسے اشعار بھی اکثر جگہ نظر آتے ہیں، جہاں وہ ایک متین و متوازن لہجہ میں اپنی خودداری کا اعلان کرتے ہیں۔ سپردگی، سچے عشق کا لازمی جزو ضرور ہے، لیکن جس قسم کی سپردگی ہمیں عام غزل گو شعراء کے یہاں ملتی ہے، وہ غیر حقیقی سی معلوم ہوتی ہے۔ محبت کے اکثر شاعروں کے لہجہ میں اُتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے، اس لئے کہ عشق کا جذبہ عاشق کو امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے، اور محبوب کا التفات اور اُس کی بے رخی، عاشق کی طبیعت میں زیر و بم پیدا کرتے رہتے ہیں۔ داغ کے جن اشعار سے ایک طرح کی نرمی، گھلاوٹ اور یگانگت سی

ٹپکتی ہے، اُن کی مثال ہم ابھی پیش کر چکے ہیں - لیکن داغ کے یہاں کلبیت (Cynicism) کے آثار کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے - شاید اس کا سبب یہ ہو کہ کلبیت جن تند و تیز اور ناکام و نامراد جذبات کا فطری ردِ عمل ہوتا ہے، وہ داغ میں کبھی پیدا نہیں ہوئے - اُن کی محبت خالص جسمانی محبت ہے، اور اس میں ایک طرح کا چٹخارہ اور کھلنڈراپن پایا جاتا ہے اس میں شوخی اور انانیت بھی ہے - یہ انانیت ہی در اصل اُس مریضانہ اور سوگوارانہ کیفیت کو زایل کرنے میں مد ہوتی ہے، جو اُمعد کے غزل گو شعراء کا کم و بیش مزاج اور اُن کے لئے معیار بن چکی تھی - یہ انانیت محبت کے اعلیٰ ترین قصور کے منافی سہی، لیکن ایک کمزور درجہ کی ارضی محبت کے لئے ایک متوازن کر دینے والی قوت کی حیثیت سے قابلِ تعریف اور قابلِ قبول ضرور ہے - یہ انانیت ہی عاشق کے اندر تجربہ سے وہ علاحدگی پیدا کرتی ہے - جو تجربہ کو سمجھنے، اُس کے خط و خال کی مصوری کرنے اور اُس کی قدر و قیمت کے متعین کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے اور اس انانیت ہی کی وجہ سے محبت کے اس راز و نیاز میں حقیقت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

تری تو پرسشِ تیغِ نظر کا کیا کہنا،
ہمیں تو دیکھ کے رکھتے ہیں ہم جگر کیسا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا
تمھاری برقِ تجلّی کو اضطراب نہ تھا؟

فرہاد کے مرجانے کا مذکور نہ کیجے،
کچھ آپ کی تلوار کا احساں نہ ہوا تھا،

وعدہ پہ مری اُن کی قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

غضب ہے آہ مری نام داغ ہے میرا
تمام شہر جلاؤ گے کیا جلا کے مجھے،

داغ کے انداز بیان میں مجموعی طور پر جو شیرینی اور شگفتگی ہے، وہ خاص اُن کی طبیعت کا رنگ ہے - مگر یہ نیاپن اور یہ تازگی محض زبان پر قدرت کا پتہ نہیں دیتی - کیونکہ الفاظ صرف تاثرات اور مشاہدات کی زبان ہیں - اُن میں حُسن کا جادو جگا دینے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے - لیکن اس میں پوری طرح کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب اُن تجربوں میں خود رعنائی اور دلکشی موجود ہو، جن کے اظہار کا الفاظ صرف ایک خارجی وسیلہ ہیں - داغ کے مزاج میں جمالیاتی احساس پایا جاتا ہے - وہ اپنے تاثرات اور مشاہدات کے بیان کرنے میں جن خارجی اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہ پڑھنے والے کے سامنے حُسن کی ایک جنّت کھول دیتی ہیں - وہ محبت کے واردات کے بیان میں جذبہ اور خارجی شے کے درمیان جو علاقہ قایم کرتے ہیں، وہ سراسر تخیلی اور جمالیاتی علاقہ ہوتا ہے - وہ اپنے جذبہ کی وضاحت کے لئے فطرت کے اُن حسین عناصر کی طرف ہمارے تخیل کو لے جاتے ہیں جن سے ہمارے حواس میں ایک قسم کی تازگی، کیف اور آسودگی پیدا ہوتی ہے - اس طریقۂ کار میں کوئی بات بالکل نئی نہیں ہے - لیکن پڑھنے والا یہ ضرور محسوس کرتا ہے، کہ شاعر نے بغیر کسی کوشش کے اُس کے ذہن میں ایک لطیف سرخوشی کا احساس پیدا کر دیا ہے - برجستگی کا یہ تاثر ایسے اشعار پڑھ کر ہمیشہ مرتب ہوتا ہے - تعجب ہے کہ اب تک ہمارے نقاد داغ کی شوخ بیانی اور اُن کی بندش کی چستی کا تو ذکر کرتے رہے - لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں دلائی کہ داغ کے تاثرات کس طرح ایک حسین پیکر میں ڈھل جاتے ہیں - اور ان میں چاندنی کا حُسن آبِ رواں کا نغمہ اور ہیرے کی دلآویزی کس طرح مل جل کر ایک ایسا مرکب طیار کرتے ہیں جو ہمارے ذہن و تخیل کے لئے انبساط کا سامان فراہم کرتا ہے - داغ اس معاملہ میں مومن سے قریب تر ہیں، اور ذوق سے بہت دور - باوجود اس کے کہ داغ کو ذوق سے فیضِ تلمذ حاصل ہوا تھا، لیکن انفرادی طبیعت کی اُپچ بھی عجیب گل کھلاتی ہے - ذوق کی شاگردی داغ کے لئے ان معنوں میں بہت مفید ثابت ہوئی کہ اُن کے اظہار بیان کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوگئیں اور اُن کے انداز میں سلاست پیدا ہوگئی --- لیکن مشاہدات کو اپنے شعور میں سمو لینے اور رچانے، اور مشاہدات و تجربات

کے معجونِ مرکب کو گوارا اور قابلِ فہم شکل عطا کرنے کا عمل، ہر شاعر کا انوکھا ہوتا ہے اور اسی لئے ہر اچھے شاعر کی پہچان اور تحسین کے لئے ایک مخصوص معیار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مومن، داغ اور حسرت کے جمالیاتی احساس میں جو فرق ہے وہ اُن کے مزاج اور ذوق کے اختلاف کے مطابق ہے۔ داغ کا رنگ مومن اور حسرت کے رنگ سے جدا ہونے پر بھی اپنے اندر ایک نکھار، دلکشی اور جاذبیت ضرور رکھتا ہے:-

شرمگیں چشم میں اُس برقِ نظر کا جلوہ ——— ایک شعلہ سا تہِ دامنِ مژگاں نکلا
جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا ——— بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح
گلشن میں ترے لبوں نے گویا ——— رس چوس لیا کلی کلی کا،
مانندِ برق، مثلِ ہوا، صورتِ نگاہ ——— اکثر نکل گئے ہیں وہ میرے قریب سے
جو سخت بات سنے دل تو ٹوٹ جاتا ہے ——— اس آئینہ کی نزاکت کسی کو کیا معلوم

داغ کی قادر الکلامی اُن کے زمانہ میں مسلّم تھی۔ اُنھوں نے زبان میں جو لوچ، سلاست اور سادگی پیدا کی، اُسے آج بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ مگر تنقید نگاری کا ایک دور ایسا بھی گزرا ہے، جب داغ کی شاعری کو عامیانہ سمجھ کر رد کر دیا جاتا تھا اور اُسے بھرپور، صحتمند اور جذبہ سے سرشار شاعری کا درجہ دینے کے لئے کوئی طیار نہیں ہوتا تھا۔

میرا یہ دعویٰ تو ہرگز نہیں ہے کہ داغ کی شاعری اُن تمام اوصاف سے مزین ہے، جو اعلیٰ عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر داغ کے عہد اُن کی شخصیت اور اُن کے معاصر شعراء کے کلام کو نظر میں رکھا جائے، اور عشقیہ شاعری کے کسی بہت بلند تصور کو معیار نہ بنایا جائے، تو داغ کے چھچلوں اور اُن کی رندی کی تہ میں بھی گوارا، برجستہ اور تخیئل پر اثر انداز ہونے والے اشعار کی تلاش بے سود ثابت نہیں ہو سکتی در اصل بعض رائیں اس قدر تواتر اور اتنی شدومد کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں کہ پھر اُن کی صداقت کی پرکھ کا کبھی خیال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بعض لیبل بعض شاعروں پر کچھ اس طرح چسپاں کر دئے جاتے ہیں، کہ پھر اُن کے بغیر اُن کا تصور دشوار معلوم ہونے لگتا ہے۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقی قوت اور فیضان کی لہر ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتی۔ غزل گو شاعر کے یہاں تو خاص طور پر حشو و زواید کی موجودگی کم و بیش لازم سی ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ تنقیدی محاکمہ کے لئے صرف منتخب اشعار ہی کو سامنے رکھنا چاہئے داغ کا لب و لہجہ اپنے بہت سے معاصرین سے مختلف ہے۔ لیکن اس میں بھی ہر جگہ یکسانیت نہیں ہے۔ پھر یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ بعض کوتاہیاں اور خامیاں، مخصوص ادبی اسالیب، روایات اور محاورہ کی پابندی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا اسی قدر ضروری ہے کہ ظاہری مسرت و اطمینان، بذلہ سنجی اور شوخ گفتاری، لذتیت اور سرمستی، بعض اوقات ایک نقاب کا کام بھی دیتے ہیں۔ متوازن، شگفتہ اور سنجیدہ اشعار بھی، جو محض تفننِ طبع کی خاطر نہیں لکھے گئے، بلکہ جن میں شاعر نے کسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے، داغ کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ داغ کی شاعری کے جن عناصر کو میں نے صحتمندی سے تعبیر کیا ہے اُن کی وضاحت اُن اشعار سے بخوبی ہو جاتی ہے، جو داغ کی جدت پسندی، اُن کے لہجہ کی نرمی، اُن کی انانیت اور اُنکے جمالیاتی احساس کے آئینہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نشاطیہ عناصر بھی ہیں، جو زندگی کی نعمتوں کو قبول کرنے اور اُن سے بہرہ اندوز ہونے کے حوصلہ کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے اہم اور غیر متوقع بات جو اس سلسلہ میں نظر آتی ہے، وہ یہ کہ داغ عشق کی نفسیات کے متعلق بعض اشارے ایسے کر جاتے ہیں۔ جن سے اُن کی پختگی اور سمجھ بوجھ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض اشارے غزل کی شاعری میں روایت بن گئے تھے، لیکن ان اشاروں کے پردہ میں بھی بعض دفعہ شاعر بڑے پتہ کی بات کہہ جاتا تھا۔ یہ اُسی وقت ممکن ہوتا تھا، جب کوئی نیا خیال، کوئی تازہ مشاہدہ، کوئی دلکش تشبیہ، کوئی نفسیاتی نکتہ روایت میں جان ڈالدیتا تھا۔ داغ کو بھی اگر ذرا

ٹٹول کر دیکھئے، تو کہیں کہیں نظر میں ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ جو کچھ ان اشعار میں کہا گیا ہے وہ محض روایت نہیں ہے، بلکہ اس کی تخلیق براہِ راست تجربہ نے کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شاعر نے اس تجربہ کے اندر عمومیت کا رنگ بھرنے کی بھی کوشش کی ہے ۔

مزا جو اضطرابِ شوق سے عاشق کو حاصل ہے — وہ تسلیم و رضا و بندگی سے ہو نہیں سکتا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال — دشمنی کا لطف، شکووں کا مزہ جاتا رہا

ہنگامِ ضبط سینہ میں سو گردشیں رہیں — اچھا رہا وہ اشک جو آنکھوں سے بہ گیا

رہروِ راہِ محبّت کا خدا حافظ ہے — اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

کئے جو ضبط بھی آنسو کبھی نہ دل کی لگی — جلے ہوئے ہیں بہت چشمِ اشک بار سے ہم

ٹھہر ٹھہر کے جلا دل کو ایک بار نہ پھونک — کہ اس میں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

داغ کا کلام ہماری غزل کے کلاسیکل سرمایہ کا ایک قابلِ قدر حصہ ہے۔ اُن کے چلبلے پن میں بھی ایک متانت اور رکھ رکھاؤ ہے اُن کے مزاج کے مختلف رنگوں میں ایک رنگ وہ بھی ہے، جسے خاص جرأت کا رنگ کہنا چاہئے۔ لیکن چونکہ معنوی اعتبار سے وہ دلی کے دبستانِ شاعری سے قریب تر ہیں۔ اس لئے معاملہ بندی کے میدان میں بھی وہ ابتذال اور سوقیانہ پن سے اپنا دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔ اور حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔ اُن کے پورے کلام میں ایک وحدتِ تاثر پائی جاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ جہاں تک اُن کی بہترین اور نمائندہ شاعری کا تعلق ہے، وہ اُن کے ہم عصر امیر کی شاعری سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ محض استادی اور مشق کے بل بوتے پر وجود میں نہیں آئی بلکہ اُس کی تہ میں جذبات کی آنچ اور اُن کی گویائی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل میں اب ہم اُن مضامین کی تلاش نہیں کرتے، جن پر پہلے سر دھنا کرتے تھے۔ تاہم ذوق، شاہ نصیر، ناسخ اور اسی قسم کے دوسرے شعراء کی نسبت داغ کے کلام میں اب بھی ہمارے لئے خاصی جاذبیت موجود ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک حسن و عشق کے جذبات و معاملات انسانوں کے دلوں کو گرماتے رہیں گے، داغ کی زبان کی چاشنی اور لطافت، اُن کے لب و لہجہ کی شوخی اور اُنکے نقطۂ نظر کی صحتمندی اور اُس کی داخلیت پڑھنے والوں سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہے گی۔

اسلوب احمد انصاری

خدا اور پادری

ولایت کے ڈاک خانہ میں سارٹنگ کلرک کو ایک لفافہ ملا جس پر یہ پتہ لکھا ہوا تھا:-

"خدا کے نام ، سب سے اونچے آسمان پر"

یہ خط ایک ضعیفہ کا تھا جس نے لکھا تھا کہ "اے خدا، میں بہت بڑھیا ہوں، مجھے پانچ پونڈ بھیج دے، نہیں تو مالک مکان مجھے گھر سے نکال دے گا، اور میں در بدر ماری پھروں گی"

کلرک مذہبی آدمی تھا، اسے بڑھیا پر رحم آیا اور اپنے ساتھیوں سے چار پونڈ ۱۰ شلنگ چندہ جمع کرکے ایک پادری کے نوٹ پیپر میں لپیٹ کر بڑھیا کو بھیجدیا۔ دوسرے دن بڑھیا کا دوسرا خط خدا کے نام آیا، جس میں تحریر تھا:-

"اے پیارے خدا، جواب کا بہت بہت شکریہ - لیکن آیندہ پادری کے ذریعہ سے کوئی رقم نہ بھیجئے کیونکہ اس نے اس مرتبہ پانچ پونڈ میں سے ۱۰ شلنگ اپنا حصہ کاٹ لیا اور مجھے صرف ۴ پونڈ ۱۰ شلنگ بھیجے -

گاہے گاہے بازخواں

ہمارے علماء کا نقطۂ نظر

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محو خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت آپ ہی بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے قواء بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد و تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکونِ جان" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اُچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہوجاتے ہیں اور آخر کار انسان بھی چونک پڑتا ہے۔ اس کے اعضاء بھی بیدار ہوجاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتی جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسی کا دوسرا نام دُنیائے عمل ہے اسی کو "عالم تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کرنا چاہئے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر تا ایں دم، کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہونگا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے، جس میں قدرت کے اس نظام فطرت کے اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو۔ جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق، مادہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ماوراء ایتھر میں عناصر آفرینش کا نواۃ اور برق پاروں کی صورت اختیار کرنا، لطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہوکر مختلف کروں، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہوجانا۔ یہ کیا ہے؟ کیا سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں، کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں۔ کیا برق پاروں کی گردش ان کا نشاطِ عمل نہیں، کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسام خداوندی کی جھلک موجود نہیں جسکے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہً جگمگا اُٹھتی ہیں۔

ابراہیم کی بت شکنی کیا اس بیداری کا نتیجہ نہ تھی، موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرمانی کے مقابل میں آجانا کیا روح و جسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا، عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا، مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ پھینک دینا کیا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا، رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں۔ کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں، کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر صادق کیفیت کا مظہر تھی، زردشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی، سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے نے سب سے بڑے انسان کا کوہِ فاران پر چڑھ کر کفارِ عرب کو پیام خداوندی پہونچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا، حسین کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور روداد عمل تھی، منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی معمہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی کا اعادہ۔

لیکن جس طرح قدرت عرصہ تک محو خواب رکھنے کے بعد نوع انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کسی ایک فرد کا انتخاب کرلیتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دو بارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے، پھر کبھی تو ایسا ہوتا

ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہوجاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا ـــــ اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کرلیتی ہے جیسے مُردہ میں از سرِ نو جان پڑجائے۔

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہوجاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہو کیونکہ جو چیز جہل کے دور کرنے کے لئے آئے گی۔ اس کی ابتدا عہد تاریک سے ہوگی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کرچکیں گی تو دورِ اصلاح ختم ہوجائے گا اگر اس کا مقصود کسی انسان کو محدود منزل تک پہونچاکر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہوسکتا ہو جس کے دائرۂ عمل سے تعین منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کی جولانگاہ قرار دیا ہے یا جس کا مدعا عقول انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے، یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے جس کی دعوت عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کرسکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہوکر انقیادِ فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہوجانا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دُنیا میں بروئے کار آئیں، ان سب کا مقصود ایک ہی تھا سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور بُرے بُرے ہیں، لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انھوں نے مقرر کئے وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ ان کا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا۔ اور عقول انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے، ان کے مقاصد تعلیم، ان کے اصول اصلاح اور اُن کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوع انسانی تک پہونچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی ازل سے لیکر ابد تک تمام کائنات کا احاطہ کرلینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوعِ انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہوکر ابناء جنس کی خدمت کرنا چاہئے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہر فطرت انسانی کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتادیا کہ انسانیت حقیقتاً نام ہے اس قوتِ عمل کا جو لانہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے۔ یقیناً اصلاحی تحریکوں کی تاریخ ارتقاء میں یہ تبلیغ ایک آخری نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرجائے اس کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہوسکتا ہے۔ غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈھتی ہیں اور میں اسکو تاریخ میں پاتا ہوں۔ یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و نامکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مایل ہوتے جارہے ہیں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کردیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوعِ انسانی کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے، ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدامِ عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس وقت وہ اُٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قوائے عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلافِ آراء پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لئے سمِ قاتل سے کم نہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہوکر ملوکیت و استبداد کی بنیاد

بڑھنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار، اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، دنیاوی نمود و نمائش قرار پا جاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور آسائشِ جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم و اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی اور اپنی کمزوریوں، اپنی نااہلیوں کا اندیشہ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا، یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالب نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ :-

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی، ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو، کسی نظامِ زندگی سے وابستہ ہو، بالکل ویسی ہی ہے، جیسے اندھوں کی وہ نزاع جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضا، کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا، اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کر کے دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ درانحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے، آج جن باتوں کو ہم حقایق و مسلمات کو کہہ بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں۔ دنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے، زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا، اب جینے کی راہیں اور ہیں اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقل انسانی کے جو دروازے مقفل نظر آتے تھے، اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراست انسانی آزاد ہے، اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے جو آزادی سے بول سکتا ہے جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قایم کر لیا ہے اور جو دنیا کی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبۂ سرور اس بناء پر ہے کہ خونخواری و زندگی سے باز رکھنے کے لئے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی —— نہیں —— یہ مسرت صرف اس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اُنے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی وہ مظہر ہے جو انسان کو انسان اعلیٰ یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے۔

من و یزداں کامل

دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے جو اپریل میں شایع ہو جائے گا۔

قیمت سات روپے آٹھ آنے

علاوہ محصول

منیجر نگار

ابوالہول کی بیداری

عہد فراعنہ کے بعد یہ بالکل پہلا موقع ہے کہ مصر کا ابوالہول اپنی نیند سے (جسے ابدی نیند سمجھا جاتا تھا) بیدار ہو رہا ہے اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب یہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھے۔

مصر کی تاریخ ایک طویل تاریخ ہے ہزاروں سال کے جبر و استبداد کی قرنہا قرن تک انسانیت کی تباہی و بربادی کی اور آغاز تاریخ سے لیکر اسوقت تک ایسے مکروہ دور کی جس میں انسانی آزادی کو ہمیشہ پامال کیا گیا اور لاکھوں انسانوں کی لاشوں پر مصر کے ملوک و امراء کے قصر امارت تعمیر کئے گئے، یہاں تک کہ قدرت کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اس نے ایک "مرد باخبر" پیدا کرکے چشم زدن میں وہاں کی بساط جبر و استبداد کو اُلٹ کر رکھدیا۔

"یہ مردِ خود آگاہ" وہ ہے جسے اب سے چند ماہ پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا لیکن آج وہ مصر کا نجات دہندہ اور مغربی سیاست دانوں کی رائے میں مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا انسان سمجھا جاتا ہے جس نے چند گھنٹوں میں فاروق کو خارج البلد کرکے تاریخ کا ورق اُلٹ دیا اور سارے ملک میں دفعتاً انقلاب کی ایسی زبردست لہر دوڑا دی جس کی مثال اتاترک کو چھوڑ کر کوئی دوسری نہیں ملتی۔

جب تک انقلاب نہیں آتا نہیں آتا، لیکن جب آتا ہے تو سیلاب کی طرح آتا ہے اور ملک کے خس و خاشاک کو چشم زدن میں بہا کر لیجاتا ہے، چنانچہ وہی مصر جہاں امیروں کے سوا کسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہ تھا، جو قوم فروشی کا سب سے بڑا بازار تھا، جہاں بھوکے ننگے انسانوں کی کراہ کا سننے والا کوئی نہ تھا، آج ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے ۔۔ ایک ایسا دور جو اپنا درخشاں مستقبل اپنے ساتھ لایا ہے اور جس کے زریں سایہ کو مشرقِ وسطیٰ کی سرزمین پر دور دور تک چھپا جاتا ہے۔

محمد نجیب جس کی عمر اس وقت ۵۱ سال کی ہے سوڈان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ عامل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی ماں سوڈانی تھی جس کا سانولا رنگ نجیب کو بھی ملا تھا اور جس پر گورے رنگ کے لڑکے ہنسا کرتے تھے۔

یہ کھیل کود کے میدان اور تعلیم گاہ میں دونوں جگہ اپنے ہمجولی لڑکوں سے زیادہ تیز طرار سمجھا جاتا تھا اور اس کے باپ کا ارادہ تھا کہ اسے یا تو قانون کی تعلیم دلائے یا پھر وہ مدرسی کا پیشہ اختیار کرے۔ اسے ان دونوں میں سے کوئی راہ پسند نہ تھی، اس لئے وہ چپ چاپ اپنے گاؤں سے ایک ہزار میل دور قاہرہ کی طرف پیادہ پا چل دیا اور وہاں فوجی مدرسہ میں داخل ہونے کی درخواست دی۔ مگر بدقسمتی سے اس کے قد کی لمبائی ایک انچ کم نکلی اور یہ داخل نہ ہوسکا۔ یہ پھر وطن واپس آیا اور اس نے دن میں پانچ مرتبہ ہر نماز کے بعد مختلف قسم کی ورزشوں سے اپنا قد بڑھانے کی کوشش شروع کردی۔ ایک سال کے بعد وہ پھر قاہرہ پہونچا اور گو اس کا قد اب بھی نصف انچ کم تھا لیکن اس کی ذہانت دیکھ کر مدرسۂ حربیہ میں لے لیا گیا۔

یہاں پہونچکر اس نے اپنی غیر معمولی محنت و ذہانت سے ڈھائی سال کا نصاب ۹ مہینوں میں پورا کرلیا اور آخر کار ۱۹ سال کی عمر میں وہ سکنڈ لفٹنٹ ہوگیا۔

اس وقت مصر کی فوج انگریزی فوج ہی کا ایک مختصر سا ضمیمہ تھی، اور نجیب ایسے سپاہیوں کے لئے جو امیروں اور درباریوں کی

خوشامد نہ کرتے تھے، ترقی کا میدان بالکل مسدود تھا۔ اس لئے اس نے ان حالات سے بیزار ہوکر اپنی فرصت میں قانون اور معاشیات کا مطالعہ شروع کردیا اور اسی کے ساتھ غیر زبانوں میں جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی زبان بھی سیکھنے لگا۔ (اب وہ عبرانی بھی پڑھ رہا ہے)

جب حال ہی میں حکومت اسرائیل اور عرب لیگ کے درمیان نزاع شروع ہوئی تو وہ یہودی حکومت پر حملہ کرنے کا مخالف تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مصری فوج ریگستانی جنگ کی اہل نہیں ہے، لیکن اس باب میں فوج والوں سے مشورہ کیا ہی نہیں گیا اور مجبوراً اسکو بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ یہ اس وقت بریگیڈیر تھا اور صحرائے سینا میں ایک مشین گن والی رجمنٹ کی کمان اس کے سپرد تھی۔

اس لڑائی میں یہ سخت زخمی ہوا اور اسرائیلی فوج اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئی، لیکن اس کا بھائی محمود اسے اٹھا لایا اور جب یہ اچھا ہوگیا تو نجیب پھر اپنی فوجی خدمات میں مصروف ہوگیا، لیکن مصری فوج کی شکست کا صدمہ اس کے دل میں بدستور باقی رہا اور ہر وقت سوچنے لگا کہ مصر کو اس کی موجودہ پستی سے کیونکر نکالا جاسکتا ہے۔

چونکہ وہ اقتصادیات و سیاسیات کا بھی ماہر ہے۔ دُنیا کی تاریخ پر بھی اسے عبور ہے زمانہ کے موجودہ رجحانات اور بین الاقوامی سیاسیات سے بھی پوری طرح آگاہ ہے، اس لئے اس نے سمجھ لیا کہ مصر کی تباہی و پستی کا اصل سبب یہاں کا جاگیردارانہ نظام ہے اور جب تک فاروق شاہِ مصر کو نہ ہٹایا جائے (جو یہاں کا سب سے بڑا مستبد جاگیردار تھا) اصلاح محال ہے۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ اس خیال کی تکمیل کے لئے طیاریاں شروع کردیں اور جب اس نے فوج میں اپنے ہمنوا کافی پیدا کرلئے تو راتوں رات وہ سب کچھ کردیا جس سے آج ساری دنیا واقف ہے۔

اس وقت مصر کی عنانِ حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے، لیکن بالکل ایک سپاہی اور مزدور کی طرح وہ اب بھی فوجی بگل کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھتا ہے، صبح کی نماز پڑھکر تلاوتِ قرآن کرتا ہے اور پھر ناشتہ کرکے جو ایک انڈے، ایک ٹماٹر اور ایک توس سے زیادہ نہیں ہوتا) ۸ بجے تک دفتر میں آجاتا ہے اور کام شروع کردیتا ہے، اسی دوران میں وہ تمام احکام نافذ کرتا ہے، مقامی کمانڈروں سے ملتا ہے اور خطوں کا جواب لکھواتا ہے (جن کی تعداد ایک ہزار روزانہ سے کم نہیں ہوتی ہے)

نجیب نے مصر کے اصلاح کی جو ذمہ داری اپنے سر لی ہے وہ ایسی آسان بات نہیں، کیونکہ امراء و جاگیردار ایک ایک انچ کے لئے اس کا مقابلہ کررہے ہیں اور رعایا کے دل سے اب تک یہ خوف نہیں نکلا کہ معلوم نہیں کل کیا ہو۔ اس کی سب سے زیادہ مخالف وفد پارٹی ہے اور رات دن نجیب کے نکالنے کی فکر میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - اشتراکی جماعت بھی وفد پارٹی کے ساتھ ہوگئی ہے اور یہ دونوں مل کر ملک میں شورش، اسٹرائک اور بدامنی پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ نجیب کے قدم جمنے نہ پائیں۔ چنانچہ حال ہی میں کاٹن مل کے ۶ ہزار مزدوروں نے اسٹرائک کرکے کارخانوں میں آگ لگانا شروع کی، پولیس پر پتھر برسائے، مشینیں توڑیں، لیکن نجیب نے فوجی مدد سے اس فتنہ کو فرو کیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں اس سے قبل بھی بعض لیڈر نجیب ہی کی طرح اُبھر چکے ہیں، لیکن اتاترک کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہوا اور مصر کا پریس اس وقت نجیب کو مصر کا اتاترک ہی سمجھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان دونوں میں بعض باتیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اتاترک کی طرح نجیب بھی سپاہی ہے، فوج ہی پر اس کو بھی اعتماد ہے اور اتاترک کی طرح وہ مصر کو بھی آزاد جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔

ان حالات میں یہ سوال بھی لوگوں کے سامنے ہے کہ آیا نجیب ترکی کی طرح مصر میں بھی کوئی جمہوری حکومت قایم کرسکے گا یا نہیں۔ اس کا جواب بڑی حد تک منحصر سمجھا جاتا ہے اس بات پر کہ برطانیہ و امریکہ کیا چاہتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ نجیب کو مصر میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے بہت سی ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جو اس کے پاس نہیں ہیں اور وہ برطانیہ و امریکہ ہی سے ملسکتی

ہں۔ مثلاً اسے اسلحہ کی ضرورت ہے، ٹکنکل امداد کی ضرورت ہے اور صنعتی فیکٹریاں قایم کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے وہ یقیناً بیرونی امداد کا محتاج ہے۔

برطانیہ یونتو وعدہ کرچکا ہے کہ وہ مصر کو اسلحہ بھی فراہم کرے گا، فوجی تربیت و آراستگی میں بھی عملی حصہ لے گا لیکن اس کیلئے غالباً شرط ضروری ہوگی کہ نجیب نہر سویز اور سوڈان کے مسئلہ پر خاموش رہے اور یہ بہ حالات موجودہ نجیب کے لئے ممکن نہیں کیونکہ اگر آج نجیب نے ان مسایل پر خاموشی اختیار کی تو کل ہی اس کی کمان اتر جائے گی۔ یہ ایک ایسی گتھی ہے جسے نہ نجیب اب تک سلجھا سکا ہے اور نہ جس پر برطانیہ کچھ کھُل کر کہنا چاہتا ہے۔

امریکہ اس مسئلہ میں اور زیادہ احتیاط سے کام لے رہا ہے۔ کیونکہ عرب حکومتوں کے مقابلہ میں وہ اسرائیلی حکومت کا طرفدار ہے اور اگر وہ مصر کو کوئی مدد پہونچا سکتا ہے تو صرف اس شرط سے کہ مصر و اسرائیلی حکومت کے تعلقات خوشگوار ہوجائیں اور مصر مشرق وسطی کی دفاعی اسکیم میں شریک ہوجائے لیکن یہ ایسی شرطیں ہیں کہ نجیب ان کو بھی آسانی سے نہیں مان سکتا کیونکہ ان کے تسلیم کرنے کے بعد اس کا موجودہ اقتدار ختم ہوجائے گا۔

بہر حال اس وقت مصری حکومت رقیق حالت میں ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ اس کی ہیئت کیا ہوگی، لیکن چونکہ اسوقت وہاں ہر طبقہ و جماعت کے عوام نجیب کے ساتھ ہیں، اور وہ کسی قیمت پر بھی اعادۂ ملوکیت پر رضامند نہ ہوں گے، اس لئے یہ یقینی ہے کہ مصری حکومت آیندہ جمہوری حکومت بنے گی اور بالکل ممکن ہے کہ نجیب ہی اس کا پہلا صدر ہو۔

لارڈ جارج انگلستان کی بڑی مشہور ہستی گزری ہے اور اس نے جس شان سے وہاں کی وزارتِ عظمٰی کی خدمات انجام دیں، وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی۔ اس کی کامیابی کے متعدد اسباب تھے لیکن سب سے بڑی صفت ان میں یہ تھی کہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بھی اُن کا دماغی توازن خراب نہ ہوتا تھا، انتخاب کا زمانہ تھا اور ہر شخص اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا، لائڈ جارج بھی مختلف جلسوں میں اپنے انتخاب کا پروپاگنڈا کر رہے تھے۔

ایک دن وہ کسی جلسہ میں لوگوں کو خطاب کر رہے تھے کہ دوران تقریر میں ایک عورت جو لائڈ جارج سے سخت متنفر تھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کو مخاطب کرکے بولی کہ :- "اگر میں تمھاری بیوی ہوتی تو یقیناً تمھیں زہر دیدیتی"

ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشتعل کردینے والا فقرہ تھا اور لائڈ جارج کی جگہ اگر دوسرا شخص ہوتا تو یقیناً برہم ہوجاتا اور خدا معلوم کیا جواب دیتا، لیکن آپ کو معلوم ہے لائڈ جارج نے اس کا کیا جواب دیا۔

انھوں نے مسکراتے ہوئے عورت سے کہا کہ "اے محترم خاتون اگر میں تمھارا شوہر ہوتا تو یقیناً اس زہر کو نہایت خوشی سے پی جاتا۔"

نئے سویرے

خوشا کہ قلعۂ و ایواں سے اُٹھ رہا ہی دھواں
اُبھر رہے ہیں افق پر نئی سحر کے نشاں

دیارِ قیصر و کسریٰ کے بجھ رہے ہیں چراغ
اُلٹ رہی ہیں بساطیں ڈھلک رہے ہیں ایاغ

جبینِ وقت پہ کھنچتے ہیں زر نگار خطوط،
مہک رہا ہے وہ شاہوں کی میتوں کا حنوط

وہ جل رہی ہیں کلاہیں سلگ رہے ہیں محل
فرات و نیل پہ کھلتے ہیں عظمتوں کے کنول

وہ مصر و روم کے ماتھوں کے داغ دھلنے لگے
وہ رطل و جام میں قند و گلاب گھلنے لگے

چلے نکل کے وہ محلوں سے سر برہنہ جلوس
عروسِ نیل کے جلووں کے بجھ گئے فانوس

قبا و ریش کے رنگین دام جلنے لگے،
دہکتی آگ میں میر و امام جلنے لگے،

خوشا کہ آج پرانے طلسم ٹوٹ گئے
صنم کدوں میں خداؤں کے جسم ٹوٹ گئے

مگر یہ کیا کہ افق پر ہے سُرخ سُرخ سی آگ
بناتِ ماہ و ثریا کا لٹ رہا ہے سہاگ

سلگ رہے ہیں ہواؤں کے ریشمی آنچل
دھڑک رہے ہیں ستاروں کے جگمگاتے محل

خرد کی آگ میں تپ تپ کے ڈھل رہے ہیں شکوک
مچل رہی ہے ارادوں میں جہل و جرم کی بھوک

ترس رہے ہیں چراغوں کو صبح و شام کے طاق
زمیں پہ آج رسولوں کا اُڑ رہا ہے مذاق

غضب ہوا کہ وہ اُترے زمیں پہ کرگس و بوم
وہ آج چلنے لگی گلکدوں میں بادِ سموم

گل و سمن کی جبینوں پہ دھول جمنے لگی
مہ و نجوم کی نبضِ حیات تھمنے لگی

یقیں کے پھول بھی وہم و شکوک چننے لگے
گنہ زمیں پہ خباثت کے دام بننے لگے

یہ کتنے دیو فرشتوں میں ہو گئے ہیں شریک
خلوص و امن کی انساں سے مانگتے ہوئے بھیک

بنام نور چمکتے ہوئے اندھیرے ہیں
نئے افق سے یہ نکلے ہوئے سویرے ہیں

ساقی جاوید بی۔ اے

مستقبل کی آواز

ہو رہی ہے بہار کی تشکیل لالہ و نسترن کی عمر طویل
اب خزاں آپ جانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

زرفشانی کریں گے لالہ و گل عطر سے پھر ڈھلیں گے ساغرِ گل
فصلِ گل رنگ لانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

لو، افق سے کرن وہ پھوٹ چلی ظلمتوں کی طناب ٹوٹ چلی
صبح، محفل سجانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

سبزہ و صحنِ باغ سجتے ہیں مہ و انجم کے ساز بجتے ہیں
چاندنی گنگنانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

کھلنے والے ہیں آئینوں کے ورق قہقہوں کی وہ نغمہ ریز شفق
شامِ گیتی پہ چھانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

کوہ و صحرا کے آبگینے میں ذرے ذرے کے تنگ سینے میں
شمع سی جھلملانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

تھے جو ثبت ایشیا کے ماتھے پر وہ دھندلکے تراشتی ہے سحر
رات، دن بن کے آنے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

پردۂ یاسمین و سنبل سے بات، نرگس سے لالہ و گل سے
تیر و پیکاں تک آنے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

کسی آذر کدے کا دلکش روپ میرے افکار کی سنہری دھوپ
چار سو پھیل جانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

فضا ابنِ فیضی

رومتہ الکبریٰ

تیرا افسانۂ ماضی ترے آدابِ کہن،
تیری تہذیب کی عظمت تری شاہی کا عروج،
جس نے روندی تھی کبھی مشرق و مغرب کی زمیں
تیری قوت کا وہ طوفان، وہ لشکر کا خروج

تیرے شاہوں کی جبینوں میں خداؤں کا وقار
تیرے دربار میں سجدوں کا، سلاموں کا ہجوم
تیرے بازار میں عصمت کا وہ زرّیں نیلام
تیری سڑکوں پہ پریزاد غلاموں کا ہجوم

جس میں انسان ہی انسان کا صیاد بنا
ہاں وہ تفریح و تفنن وہ ترا سیر و شکار
موت کے کھیل سے خوش ہوتی تھیں جن کی روحیں
تجھ میں ایسے بھی تھے کچھ ماہ لقا مہر نگار

تیری وحشت کا یہ انداز نیا دیکھا ہے
خود ترے خون کے چھینٹے ہیں ترے دامن پر
پھونک ڈالا ہے چراغِ تہِ داماں نے مجھے
بجلیاں گرتی ہیں تیری ہی ترے خرمن پر

اور وہ دولت و ثروت کی سنہری زنجیر
جس نے "مایا" کا حسین جال بُنا تیرے لئے
اور وہ مسندِ شاہی کی طربناک بساط
جو کہ بازیچۂ اطفال بنی تیرے لئے

تیرے محلوں کی کنیزوں نے جسے چھیڑا تھا
اب بھی ہے دہر میں وہ سازِ مسرت لرزاں
تیرے بازارِ تمدن میں جو بکتی تھی کبھی
اب بھی دُنیا میں ہے وہ جنسِ غلامی ارزاں

تیری تہذیب کے ہاتھوں نے جلایا تھا جسے
طاقِ مغرب میں فروزاں ہے ابھی تک وہ چراغ
آبِ خنجر سے ترے جس میں لہو ٹپکا تھا،
اب بھی ہے خون سے لبریز وہ مشرق کا ایاغ

اب بھی ہے جبر کے ہاتھوں میں سیاست کی زمام
زندگی سلسلۂ دار و رسن ہے اب تک
اب بھی جمہور سے برہم ہے سلاطیں کا مزاج
تیریِ تاریخ کے ماتھے پہ شکن ہے اب تک

تنویر احمد علوی تنویر

صدائے بازگشت

تری نگاہ سے ظاہر ہے بے دلی کا وفور — عیاں جبیں سے ہے ناکامی و پشیمانی،
بُجھا بُجھا سا ہے دل میں ترے شرارِ خودی — ترے دماغ میں رقصاں ہے فکرِ لایعنی
تو حادثات دمادم سے کھا رہا ہے فریب — سمجھ میں آ نہ سکا تیری سرِّ یزدانی
اسی کا نام ہے اے دوست! ارتقائے حیات — یہی کشاکشِ پیہم ہے رازِ انسانی
خرد سے پا نہ سکے گا تو وہ مقامِ کمال! — کہ جس سے تجھ کو میسر ہو دل کی تابانی
تو جگمگاتے ستاروں کی روشنی پہ نہ جا — کہ مستعار ہے اُن کی یہ نور افشانی!
عمل، خلوص، یقیں، عزم و فکر کا فقداں! — رُلا رہی ہے مجھے تیری خستہ سامانی
خودی کی موت سے یہ حال ہو گیا ہے کہ آج — نہ تجھ میں سطوتِ سنجر نہ شانِ سلمانی

ولے ہنوز بایں صد خرابیِ بسیار
اگر تو چاہے تو آئے قدم قدم پہ بہار

حمید قادری ذوق

جگر بریلوی :-

نہ خم و سبو ہوئے چور ابھی نہ حجابِ پیرِ مغاں اُٹھا — ابھی مست بادہ پرست ہیں ابھی لطف بادہ کہاں اُٹھا
جو حضورِ چیں بجبیں ہوئے کہا کس نے شورِ فغاں اُٹھا — رہے خیر برقِ نگاہ کی کوئی دل جلا نہ دھواں اُٹھا
کسی رہگزر میں پڑے ہیں ہم عبث آسماں کی ہیں بخششیں — کوئی لاکھ اُٹھائے اُٹھیں گے کیا کبھی پاؤں کا بھی نشاں اُٹھا
ہے حجابِ حُسن کا یہ اثر کسی خود پرست کو کیا خبر — جو ازل سے سینے میں جوش تھا وہی بن کے شورِ فغاں اُٹھا

کسی میکدے میں رہا جگر کہ تھا محوِ خواب میں رات بھر
ہوئیں کیا بشارتیں صبحدم کہ اُٹھا تو زمزمہ خواں اُٹھا

جگر بریلوی

اکرم دھولیوی :-

تمنا میں اداسی میں خوشی میں غم میں گزری ہے
حیاتِ عشق ہر دم اک نئے عالم میں گزری ہے

نہیں منت کش لفظ و بیاں روداد دل اپنی،
کسی سے کیا کہیں جو کچھ کسی کے غم میں گزری ہے

طریقِ زندگی کے پیچ و خم ہم سے کوئی پوچھے
کہ ہر ساعت ہماری کاوش پیہم میں گزری ہے

خزاں کا رنج ہی کیسا گلہ ہے فصلِ گل سے بھی
کہ ہم پر اک نئی افتاد ہر موسم میں گزری ہے

نشاط و عیش ہی کو ہم سمجھ لیں زندگی کیونکر
ہے آخر زندگی وہ بھی جو رنج و غم میں گزری ہے

افتخار اعظمی :

شبِ غم میں تارے لٹاتا رہا ہوں — محبت میں آنسو بہاتا رہا ہوں
چمن میں نہیں ہوں، تو کیا، خونِ دل سے — قفس میں گلستاں بناتا رہا ہوں
حوادث کے اِن خارزاروں میں ہمدم! — گلوں کی طرح مسکراتا رہا ہوں
"محبت کی تاریکیٔ یاس میں بھی" — چراغِ تمنا جلاتا رہا ہوں

خزاں میں بھی اہلِ چمن کو میں انور
نویدِ بہاراں سناتا رہا ہوں

مطبوعات موصولہ

The Mind Al-Quran builds

۱۱۴ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے انگریزی کی، جس میں فاضل مصنف ڈاکٹر سید عبداللطیف سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے تعلیمات قرآنی کی اس روح کو پیش کیا ہے جسے اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے اور جس سے اعراض کر کے دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع دیا جاتا ہے کہ اسلام ایک خونخوار و خونریز مذہب ہے، حالانکہ اسلام کی حقیقی تعلیم یکسر صلاح و تقویٰ کی تعلیم ہے اور اس کی غایت صرف امن پسندی و صلح کوشی ۔۔۔۔ فاضل مصنف نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں انسانیت، اخوت اور امن پسندی کی جیسی زبردست تعلیم اسلام نے دی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے۔

یہ کتاب صرف آٹھ ابواب پر منقسم ہے، لیکن انھیں چند ابواب میں تمام عقاید اسلامی پر فاضلانہ تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ اسلام کے صحیح خط و خال کیا ہیں اور اگر ہم تمام اس غیر صالح مذہبی لٹریچر سے قطع نظر کرلیں جس نے اسلام کے چہرہ کو مسخ کر رکھا ہے تو اس میں وہ تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جو جملہ بنی نوع انسانی کو بلا لحاظ ملک و ملت ایک ہی رشتہ سے وابستہ کر سکتی ہیں پچھلی نصف صدی میں دنیا دو نہایت ہولناک جنگوں سے گزر چکی ہے اور تیسری کے اندیشہ سے لرزہ براندام ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ صلح و آشتی اور امن و سکون کی اہمیت کو مختلف پہلوؤں سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اسلام کی طرف سے اس فرض کے ادا کرنے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اچھا ہوتا اگر اس کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ ہی ساتھ شایع کر دیا جاتا۔ یہ کتاب اکاڈیمی اسٹڈیز آغا پورہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اُردو غزل

بڑی مشہور و مقبول کتاب ہے، ڈاکٹر یوسف حسین (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی) کی جو اس سے قبل شایع ہو کر ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ اسی کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے مجلد شایع کیا ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں جو ۴۰۰ صفحات کو محیط ہے، اُردو غزل پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو تبصرہ اتنا بسیط و طویل ہوگا، اس میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس میں اُردو غزل پر سنجیدہ اور مفکرانہ انداز سے نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ حالی نے اپنی کتاب میں شاعری پر تبصرہ کے ساتھ ہی ساتھ غزل گوئی کی طرف سے لوگوں کے رجحان کو ہٹا کر افادی منظومات کی جانب مایل کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں غزل گوئی پر محض جذباتی، نفسیاتی، فنی اور عصری حیثیت سے نگاہ ڈال کر اس کی افادیت سے بحث کی ہے، اور اس لحاظ سے یہ کتاب مقدمۂ شعر و شاعری سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

اُردو میں فن انتقاد اپنے صحیح معنے میں حال کی چیز ہے۔ اس سے قبل یہاں صرف تذکرہ نویسی کا رواج تھا جس کی حیثیت ذاتی بیاض سے زیادہ نہ تھی۔ سب سے زیادہ مشہور تذکرہ آخری زمانہ کا "آبِ حیات" ہے۔ لیکن چونکہ اس میں بھی نقد و تبصرہ سے زیادہ شاعری کی گئی ہے، اس لئے کوئی زیادہ وزنی چیز نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری اور غزل گوئی پر اس وقت تک متفرق طور پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن جس جامعیت اور شرح و بسط کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس کتاب میں خدا جانے کتنے مباحث پر گفتگو کی گئی ہے لیکن چونکہ ان کی تقسیم کرکے انھیں جدا جدا عنوانات سے پیش نہیں کیا گیا اس لئے اس کی حیثیت لکچر کی سی ہوگئی ہے، بہتر ہوتا اگر ترتیب میں اس کا لحاظ رکھا جاتا۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں ۲۰۰ صفحات پر شعراء کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے جو ولی اورنگ آبادی سے لیکر زمانہ حال تک کے ۱۰۹ شعراء پر مشتمل ہے، اور یہ انتخاب اتنا اچھا کیا گیا ہے کہ اگر تبصرہ کے حصہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔

مکتبۂ جامعہ نے یہ کتاب شایع کرکے اس میں شک نہیں زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔جس کی ملک کو قدر کرنا چاہئے۔ اس کی قیمت دس روپیہ ہے جو اس کی خوبیوں کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب

دُنیا میں بعض سائے حقیقت میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور بعض حقیقتیں سائے ہیں، لیکن یہ تبدیلی ازخود نہیں ہوتی، زمانہ مجبور کرتا ہے، زمانہ کے ساتھ ساتھ رجحانات میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ مجبور کرتے ہیں۔ چند سال پہلے جب ترقی پسند ادب کی صدا بلند ہوئی تو وہ حد درجہ ضعیف و مضمحل تھی اور اس کی حیثیت سایہ سے زیادہ نہ تھی لیکن آج یہ سایہ ایک حقیقت نظر آتا ہے اور اس کے اثرات اس قدر وسیع ہوگئے ہیں کہ مشکل ہی سے آج کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہوگا جو اس سے دامن بچاکر نکل جانے میں کامیاب ہوسکے۔

اس میں شک نہیں کہ "ترقی پسند ادب" میں ہم کو ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو حد درجہ معیوب و مکروہ ہیں اور اس جماعت میں بعض ایسے ادیب و شاعر بھی شامل ہیں جن کا وجود "ترقی پسندی" کی پیشانی کے لئے داغ ہے تاہم، یہ ضروری نہیں کہ ہم ہر اس شخص کو جو اپنے آپ کو ترقی پسند شاعر یا ادیب کہتا ہے اسے سمجھیں بھی ایسا ہی اور محض اس کے وجود کی وجہ سے ترقی پسندی کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر دیں۔

اس کتاب میں سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی تاریخ نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کی ہے اور تمام ان مباحث کو لے لیا ہے جو موضوع کے لحاظ سے ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں اس تحریک کے آغاز مقاصد اور غایات ہیں تمام باتوں کا علم ہوجاتا ہے اور جن سے بہت سی وہ بدگمانیاں دور ہوسکتی ہیں جو ترقی پسند ادب کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہیں۔

افراد و اشخاص کے ذکر میں البتہ زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا اور اس میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی شامل کر دئے ہیں جو کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہ تھے۔

یہ کتاب نہایت اچھے کاغذ پر ٹائپ میں شایع کی گئی ہے اور انجمن ترقی اُردو علی گڈھ سے جس نے اسے شایع کیا ہے مل سکتی ہے۔

مسلمان اور نظریۂ شرافت

تصنیف ہے جناب رفیق مارہروی کی جسے نظامی پریس بدایوں نے شایع کیا ہے، نسلی برتری کے احساس نے ہمیشہ انسانیت کو چھوٹے بڑے طبقوں میں تقسیم کیا ہے، گو آج نسلی تفوق کا یہ احساس کم ہوتا جا رہا ہے مگر سادات میں اب بھی یہ احساس اکثر و بیشتر موجود ہے، قرآن نے تمام انسانوں کو خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، شاہ ہوں یا گدا، ایک ہی درجہ دیا ہے، اسلام کی نگاہ میں وجہ فضیلت اگر کوئی چیز بن سکتی ہے تو وہ ہے پاکیزگی و تقویٰ، جناب رفیق مارہروی نے اپنی اس کتاب میں نہایت تحقیق سے یہ بات بے نقاب کی ہے کہ سادات کے صحیح النسب ہونے کا ادعا کہاں تک صحیح ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ شرافت و نجابت کے جو تصورات انھوں نے قایم کئے ہیں وہ روایات کی روسے یکسر غلط ہیں، وہ نسلی حیثیت سے کچھ اس طرح خلط ملط ہیں کہ حفظِ نسب کا دعویٰ قطعاً باطل ہوجاتا ہے

مؤلف نے اس کتاب میں نہایت خوبی سے وہ تمام روایات پیش کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سادات نسلی حیثیت سے کس طرح اور کب خلط ملط ہوئے، روایات کی چھان بین میں اُنھوں نے بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے کہیں بھی اعتدال و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے، جہاں بہت سے خاندانوں کا ذکر کیا ہے وہیں اپنے خاندانی حسب و نسب کو بھی نہایت بیباکی سے بے نقاب کیا ہے، کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت دقتِ نظر اور علمی ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے، جو بات بھی کہی گئی ہے اُس میں اگلی پچھلی روایات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ موضوع و معنی کے لحاظ سے یہ کتاب جتنی پسندیدہ ہے، طباعت و کتابت کے لحاظ سے اتنی ہی غیر پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

سرود و خروش

مجموعہ ہے جناب جوش ملیح آبادی کی نظموں کا جو انھوں نے پچھلے چند سالوں میں لکھی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے اس مجموعہ کی نظمیں مختلف ابواب میں تقسیم کی جا سکتی ہیں جن میں حسن و عشق، مذہب و سیاست، معاشرت و معیشت سبھی کچھ شامل ہیں، لیکن جوش اپنی شاعرانہ خصوصیات کو انھیں نظموں میں زیادہ قائم رکھ سکے ہیں، جو رندی و سرمستی سے تعلق رکھتی ہیں یا اس سے قریب تر ہیں۔

جوش کی شاعری میں نشاط و ولولہ کی کمی نہیں لیکن وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا آرٹ ہے جس سے پورا لطف اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے جذبات و تاثرات اور ذوق و احساس کو ایک خاص دایرہ کے اندر لے آئے اور یہ بات باوجود آسان ہونے کے اسقدر آسان نہیں کہ بلا استثناء ہر شخص اس میں کامیاب ہو سکے۔

جوش اپنے عہد کا بڑا کامیاب طنز نگار شاعر ہے اور ان کی شاعری کی یہی وہ خصوصیت ہے جس پر دو رایوں کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں۔

یہ مجموعہ گلاب سنگھ اینڈ سنز دہلی نے شایع کیا ہے لیکن محض قیمت بڑھانے کے لئے کتابت ایسی کرائی گئی ہے کہ حجم زیادہ ہو جائے، ورنہ یہ ۳۶۸ صفحات کی کتاب آسانی سے ۲۵۰ صفحات میں آسکتی تھی اور اس کی قیمت بھی نصف ہو سکتی تھی۔ اب بھی اس کی قیمت سات روپیہ بہت زیادہ ہے۔

قائد ملت

یہ کتاب مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خاں کی زندگی اور پاکستان میں ان کی سیاسی جدو جہد سے تعلق رکھتی ہے جسے فضل حق صاحب قریشی نے نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں مرحوم کی بیگم، جناب غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان اور جناب خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان کے اعترافات پیش کئے گئے ہیں اور پھر مختصراً مرحوم کی حیات درج کی گئی ہے جو قیام پاکستان سے قبل و بعد دونوں زمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن بڑا حصہ مرحوم کی ان تقریروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف مواقع پر پاکستان اور پاکستان سے باہر دوسرے مقامات پر کیں۔

مرحوم نے قاید اعظم محمد علی جناح کے بعد، پاکستان کی بقا و ترقی کے لئے جو کچھ کیا وہ تاریخ پاکستان کا بڑا اہم حصہ ہے اور ان کے جذبۂ خلوص و ایثار کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اسے کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ قریشی صاحب کی اس تالیف کو قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کتاب پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے اور ہے میں ادارۂ ہمدرد صحت آرام باغ روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔

ابتدائی معاشیات

اچ - اج حسن بی، اے کی تالیف ہے جس میں معاشیات کے تمام اساسی و ابتدائی اصول کو سہل زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے تین ابواب بالکل پاکستان کی آبادی اور وہاں کے معاشی مسایل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ کتاب وہیں کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اخیر میں فہرست اصطلاحات بھی دیدی گئی ہے جو

افادہ سے خالی نہیں۔ یہ کتاب اقبال بک ڈپو کراچی سے مل سکتی ہے۔

نقش جمیل مجموعہ ہے جناب جمیل مظہری پروفیسر پٹنہ کالج کی نظموں کا جسے جناب رضا نقوی نے مرتب کرکے مکتبۂ ادب پٹنہ سے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اسے ۵ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تفکرات و تاثرات، رومانیات وشبابیات، سیاسیات وعمرانیات، متفرقات اور باقیات، حالانکہ اس تقسیم کی چنداں ضرورت نہ تھی اور موخرالذکر دو ابواب کی نظمیں ابتدائی تین ابواب میں سے کسی نہ کسی باب میں شامل کی جاسکتی تھیں۔ جناب جمیل مظہری ملک کے ان چند مخصوص شعراء میں سے ہیں جو اُردو شاعری میں اسوقت نہ صرف استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستاں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص میں مطالعۂ فطرت کا سلیقہ اور تخیئل کی وسعت پائی جائے تو اس کے "شاعر بالقوة" ہونے میں کلام نہیں لیکن اگر وہ اس قوت کا منہ کے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہے تو قدرت کی یہ تمام شاعرانہ ودیعتیں بیکار ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ایک شاعر کے مرتبہ اور اس کے اقدار شاعری کو متعین کرتی ہے۔

جناب مظہری نے سب سے پہلی نظم (مالن کی بیٹی) ۱۹۲۴ء میں کہی تھی (ممکن ہے غزل گوئی کی ابتدا اس سے پہلے ہوچکی ہو) جبکہ انکی عمر ۱۸ سال کی تھی، لیکن اس کمسنی میں بھی ان کی شاعرانہ پختگی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ آپ کو اس نظم کے ان دو شعروں سے ہوسکتا ہے

چنا چن کے پروتی جاتی ہے دھاگے میں شگفتہ کلیوں کو
دھاگا جو اُلجھ جاتا ہے کبھی ماتھے پہ شکن پڑجاتی ہے

بچپن کا تقاضہ ہے شوخی، شوخی کا نتیجہ ہے غیرت		جھک جاتی ہیں آنکھیں شرم سے خود ہونٹوں پہ ہنسی جب آتی ہے

اس رنگ سے ہٹ کر مفکرانہ انداز میں ان کی آخری نظم دھارے کے عنوان سے نظر آتی ہے جس کا آخری بند یہ ہے:-

میں ان دھاروں میں کیونکر ناؤ اپنی چھوڑ دوں آخر
انھیں آنکھوں سے دیکھا ہے جنھیں گرداب میں جاتے
میں دھاروں کو نہیں سیلاب کا قایل ہوں اے ساقی
یہ سب دھارے سمٹ کر کاش اک سیلاب بن جاتے

اس مجموعہ میں جتنی نظمیں مختلف ابواب کے تحت شایع کی گئی ہیں وہ اپنے عنوانات کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہیں اور بعض بعض بہت بلند ہیں۔ ملک عرصہ سے جناب جمیل مظہری کے افکار شعری کی اشاعت کا منتظر تھا، اس لئے ملک کو جناب رضا نقوی کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کے اصرار وسعی سے یہ مجموعہ منصۂ شہود پر آسکا، ہمیں امید ہے کہ جناب جمیل کی غزلوں کا مجموعہ بھی جلد شایع کریں گے۔

سالِ نو کی
عظیم الشان رعایتی فہرست
فوراً طلب فرماکر فائدہ اُٹھائیے
الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی یہ پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:- (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادئین کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا آخر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون و حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD NO. A 466

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری - مارچ ۱۹۴۶ء

جو خمانتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہو تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈسن کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات علمی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اسوقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادبی حصہ لیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپکو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور و قیام